رباعیات صادقین نقاش

۱۳۹۰

انجم کو چاہیے ایک بھولا بھٹکا مسافر

عاصی صادقین عفی عنہ

صادقین نے اپنے گھر سبطین منزل، چورنگی ۲، ناظم آباد کراچی سے ان اوراق کا جملہ ہر کام خود ہی کر کے یہ جلد تیار کی

کتاب کا نام: رباعیات صادقین نقاش

طباعت اوّل: مئی ۱۹۷۰
طباعت دوئم: ستمبر ۱۹۷۱
طباعت سوئم: ستمبر ۲۰۰۹
سرِ ورق: صادقین
پیش لفظ کی کتابت اور نظر ثانی: تابش خانزادہ
کمپوزنگ اور ترتیب: رفّی احمد
ناشر: صادقین فاؤنڈیشن
Printed at Copy2Copy, U.S.A.
ISBN: 1-4392-5051-0

9415 Maler Road, San Diego, CA 92129, U.S.A. www.sadequainfoundation.com

پیش لفظ

صادقین ۔عالمی شہرت یافتہ مصور۔اپنے تجربات اور تجزیات کا اظہار لکیروں اور رنگوں کی زبان سے کینوس پر تو کرتے ہی تھے۔انہوں نے شاعری کے گلزار میں بھی گلفشانی کی تھی۔ جسکے نتیجے میں انہوں نے اپنی زندگی میں تین مجموعے بنام بیاضِ صادقین ۔رباعیاتِ صادقین نقاش اور رباعیاتِ صادقین خطاط طبع کیئے۔صادقین نے ہر چندکہ دنیا کے پانچوں برِاعظموں میں اپنے شاہکاروں کی نمائش کی اور وہاں کی عوام اور تہذیب کو قریب سے دیکھا اور پرکھا۔مگر اپنے ملک کو مستقل طور پر چھوڑنا گوارا نہ کیا۔صادقین مشرقی قدروں کو دل کے قریب رکھتے تھے۔جس طرح انکی تصاویر کا عمومی موضوع۔ جنگ ۔ بے انصافی ۔زرگری اور دیگر معاشرتی کالے دھندوں کی نقاب کشائی ہے۔اسی طرح انکی شاعری بھی معاشرتی بدکاریوں کو نظم بند کرتی ہے۔صادقین نے اپنے شاعرانہ طرزِ بیان کے لئے صنفِ رباعی کو ترجیح دی۔رباعی چار سطور پر مبنی مختصر نظم اور غزل کا امتزاج ہے۔بعض ماہرین کا خیال ہے کہ اپنے موضوعات کی فراوانی کی بدولت رباعی نثر سے بھی مطابقت رکھتی ہے۔ان تمام توصیفات کی وجہ سے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ رباعی اردو اور فارسی ادب کی مشکل ترین صنف ہے۔

کسی مصور یا شاعر کے کام کو سمجھنے کے لیے اسکے معاشی پس منظر کو سمجھنا بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ اس پس منظر کے سائے مصور یا شاعر کے کام پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔صادقین نے صنفِ رباعی کو ترجیح دی اور اسے اپنے خیالات کو قلمبند کرنے کا وسیلہ بنایا۔انہوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اسکی ثقافتی علامات میں رباعی بحیثیتِ ایک صنفِ سخن کے ثقافتی علامت تھی۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف حصے تک حمدیہ نعتیہ اور اخلاقی موضوعات پر مبنی رباعیات بچوں کو ابتدائی عمر سے ذہن نشین کرائی جاتی تھیں۔اسکے علاوہ خوشخط لکھی ہوئی رباعیات دیواروں پر بھی آویزاں کی جاتی تھیں۔صادقین کو بچپن سے ہی تختی پر رباعیات لکھنے کا شوق تھا۔چار مصروں پر مشتمل رباعی کی ساخت آسانی سے پہچان میں آجاتی ہے۔اور چونکہ رباعی پڑھنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔اسلئے ہر رباعی میں صوتی زیر و بم کی یکسانیت بھی صوتی احساسات کو جگادیتی ہے۔

صادقین نے سترہ برس کی عمر میں باقائدہ رباعیاں کہنا شروع کیں۔لیکن یہ عمل شوق کی حد تک رہا اور پھر رفتہ رفتہ بالکل چھوٹ گیا۔کیونکہ وہ اپنے بنیادی شوق،یعنی مصوری میں محو رہے۔یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھار اس میدان میں بھی طبع آزمائی جاری رکھی۔لیکن باقائدگی سے اس صنف کو اگلی دو دہائیوں تک نہیں سنوارا۔وہ کہا کرتے تھے کہ انہوں نے کوئی بھی کام عادتاً نہیں کیا۔غالب کا یہ مصرع (آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں) صادقین کے کام پر صادق آتا ہے۔بقول صادقین ایک بار آدھی رات بھیگ چکنے کے بعد عالمِ سرخوشی کی ابتدائی خوبصورت ساعتوں میں سوچا کہ اگر خیام جیسے شاعر کی رباعیات یاقوت جیسے خطاط نے لکھیں اور پھر مانی جیسے مصور نے ان پر تصاویر بنائیں تو یہ مجموعہ ہوگا تو بڑا عظیم الشان لیکن گروپ شو ہوگا۔اسی وقت رباعیات کی طباعت کا نقشہ ذہن میں بجلی کی طرح کوند کر ایک جھلک تہ خانۂ خیال کے گھپ اندھیرے میں دکھا گیا اور عالمِ سرخوشی میں یہ رباعی لکھی۔

رنگوں کی حدود میں دکھاؤں گا وہ شے	خاکوں کی قیود میں دکھاؤں گا وہ شے
جو کچھ کہ عدم میں دیکھتا ہوں میں آج	کل تم کو وجود میں دکھاؤں گا وہ شے

اس کے بعد چوکی پر ایک ہی نشت اور ایک ہی رو میں فنی اعتکاف کا سلسلہ شروع ہوگیا۔چالیس راتوں اور انتالیس دنوں کے اس چلے میں کام تکمیل کو پہنچا۔جو آٹھ سو سے زیادہ رباعیات پر مشتمل تھا۔صادقین کی نظر میں کتاب کسی کے نام منسوب کرنا ہلکی بات لگتی تھی۔وہ تو اپنی تصاویر کی نمائش کا افتتاح بھی کسی مہمانِ خصوصی سے نہیں کرواتے تھے۔لیکن کچھ سوچ کر دور دراز کے بزرگ جنکا تصور تقریباً اتنا ہی دھندلا خیالات میں آتا ہے جتنا کہ دیومالائی دیوتاؤں کا تصور۔انتساب کے طور پر صادقین نے مندرجہ ذیل رباعی لکھی۔

جب پایۂ تکمل کو پہنچا کل شام	دل میں یہ کہا میں نے اٹھا کر اک جام
منسوب میرا ماہ گذشتہ کا یہ کام	خیام کے یاقوت کے مانی کے ہے نام

صادقین نے اپنی رباعیات کی خطاطی اپنے ہاتھ سے کی۔اس عمل کا پس منظر انہوں نے اس طرح قلمبند کیا ہے کہ مئی ۱۹۶۹ میں غالب کے اشعار پر مشتمل ایک نمائش کراچی میں کرنے کے

بعد وہ لاہور چلے گئے۔ اواخر اگست ۱۹۶۹ سے جنوری ۱۹۷۰ تک شبانہ روز مزید رباعیاں لکھیں۔ اور انکی مناسبت سے خاکے بنائے۔ اسی دوران رباعیات کی طباعت کے لئے خطاطی بھی کی۔ اور جب رباعی گوئی خطاطی اور خاکوں کا شیرازہ سمیٹ لیا اور صورتِ حال ایک مجموعی شکل پکڑ گئی تو اپنی رباعیات کو سراہنے کے لئے یہ رباعی کہی۔

روٹھا جو جمال ہے منایا میں نے — اک جشنِ وصال ہے منایا میں نے
اس عمرِ عزیز کا رباعی کہہ کر — چالیسواں سال ہے منایا میں نے

رباعی گوئی۔ قلندارنِ ادا آشنا۔ حکیمانِ حقیقت شناس اور سلاطین لشکر انداز غرض سب نے کی اور اسرارِ عبودیت سے پردے ہٹائے۔ سید ابوسعید صوفی بزرگ تھے۔ بوعلی سینا حکمت اور فلسفے کا ستون۔ بابر ایک فاتح دوراں۔ اور عمر خیام ایک ماہرِ فلکیات اور ریاضی دان تھے۔ صادقین نے اپنی تصنیفِ رباعیات کا سب ٹائیٹل ۔ کوچہ خیام میں ایک بھولا بھٹکا مسافر رکھا۔ عمر خیام اپنے زمانے کا شعبہ فکر وفن میں غیر معمولی مہارت کا حامل اور نابغہ کہلانے کا مستحق تھا۔ جس طرح عمر خیام نے فن کی بلندیوں پر دو متضاد فنون کی ایجادی قوتوں کو چھوا۔ اسی طرح صادقین نے مصوری اور رباعی گوئی کی اختراعی قوتوں کا مظاہرہ کیا۔ اور اس سطح پر طبع آزمائی کی جہاں بہت کم لوگوں کی رسد ہوتی ہے۔ لیکن صادقین کی کمزوریاں انکا اپنے ملک سے لگاؤ اور فقیرانہ مزاج تھا جسکی وجہ سے انکے کمالِ فن کی تشہیر اردو کے حلقہِ اثر تک ہی محدود رہی۔ صادقین نے خود اپنے بارے میں کہا ہے:

میں حسن کی جس انجمنِ ناز میں ہوں — جو کچھ بھی ہوں خود اپنے ہی انداز میں ہوں
خطاط کے، شاعر کے، مصور کے سوا — میں اور بہت کچھ ہوں۔ مگر راز میں ہوں

اپنی ذات میں وہ کیا کچھ تھے۔ یہ راز انکی خطاطی اور مصوری سے تو مترشح ہے ہی۔ لیکن چونکہ رباعی گوئی میں براہِ راست زبان و بیان سے کام لینا ہوتا ہے۔ اس لئے علامات اور کنایات کے باوجود یہ راز فاش ہوگیا۔

میں کچھ نہیں کہہ کر یہ ابھرنا کیا ہے　　اپنی عظمت سے یوں مکرنا کیا ہے
یہ کوئے ادب میں انکساری میری　　پابندیِ تہذیب ہے ورنہ کیا ہے

صادقین کی تحریروں سے یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ جس طرح وہ مصوری اور خطاطی کے فن اور اسکی تاریخ سے واقف تھے۔ اسی طرح رباعی کے وزن اور اسکی ایجاد وارتقا کی تاریخ سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ جب رباعی کا فن اتنا مشکل ہے تو پھر صادقین نے اسے کیوں اپنایا۔ اپنی بیاض کے دیباچے میں صادقین نے لکھا ہے کہ انکے نزدیک رباعی کی صنف حقیقاً ذاتی واردات کے اظہار کی صنف ہے۔ انکی رباعیات انکی وارداتِ قلبی اور امورِ ذہنی کی فطری تصاویر ہیں۔ یہ رباعیات چونکہ عام طور پر کسی موقع یا موضوع کے سلسلے میں برجستہ گوئی کا نمونہ ہیں۔ اس لئے روح کے تاروں کو چھو کر دل میں سراعت کر جاتی ہیں۔ انہوں نے الفاظ سے زیادہ خیال اور لمبی تمہید سے زیادہ برجستگی کو اپنایا ہے۔ رباعی لکھنے کے محرکات کے بارے میں خود صادقین کہتے ہیں۔

کب ہیں روشِ عام کے لکھنے والے　　حرفوں کو ہیں دل تھام کے لکھنے والے
تختی پہ شبانہ روز خونِ دل سے　　ہم تو ہیں ترے نام کے لکھنے والے

یہ حسن پرستی جو ہے گُو ہی گُو ہے　　ہاں رنگ ہی رنگ ہے بُو ہی بُو ہے
آئینے ہی آئینے ہیں میرے دل میں　　اور کون ہے آئینوں میں تُو ہی تُو ہے

اچھی صورتیں اگر گردو پیش ہوں تو اردگرد کی جمالیاتی۔ رنگین اور حسین صورتِ حال۔ نگاہِ حقیقت آشنا اور قلبِ حق آگاہ میں ایک لطیف کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ بقول میر انیس (پڑھیں

درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو) جمالِ ہم نشیناں کا تاثر دورانِ خون میں شامل ہو کر محسوسات کو الفاظ میں ڈھالنے کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ مندرجہ ذیل رباعیات انہی جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

ساقی نے ہمیں ساغر جم بخشے ہیں
ہاتھوں میں سیاہ زلف کے خم بخشے ہیں
مولا نے حسینوں سے وفا کے بدلے
دنیا میں ہمیں لوح و قلم بخشے ہیں

دل رخ پہ نہ ہونے کا یہ شکوہ تیرا
اے شوخ کہوں حسن ہے کیسا تیرا
اِن میں بھی نہیں نقطہ نہ اُس پر تل ہے
کلمہ ہے، درود ہے، یہ مکھڑا تیرا

اک شوخ کے دیکھے خط، رباعی لکھی
ناقد نے کہا غلط رباعی لکھی
تھا وہ رخِ بے خال تو میں نے اسکی
توصیف میں بے نقط رباعی لکھی

ہم نے تو جمالِ ماورا کو دیکھا
اور اس نے گنہ کی انتہا کو دیکھا
ہاں شیخ نے شیطان کو لیکن ہم نے
صورت میں حسینوں کی خدا کو دیکھا

ہر حرف میں مہ پاروں کے قد بنتے ہیں
لوحوں پہ وہ اک حسن کی حد بنتے ہیں
کاکل کے خیال ہی میں لکھتا ہوں میں لام
ابرو کے تصور ہی میں مد بنتے ہیں

ایک مشاہدے کے مطابق اکثر اچھا کام ارادتاً نہیں بلکہ اتفاقاً ہوجاتا ہے۔اب رباعی ہی کو لیں جسکی ایجاد بھی اتفاقاً ہوئی تھی۔ امیر یعقوب کے کمسن لڑکے کا چھٹا کنچا اگر سیدھا گچھی میں چلا گیا ہوتا تو وہ خاموش رہتا یا کچھ اور کہتا۔امید وبیم کی کیفیّت کا اظہار اس نے جن الفاظ سے کیا۔غلطاں غلطاں ہمیں رود تالب گو (ہولے ہولے گیا اور کنارے پہ جا رکا) وہی صنفِ رباعی کی بنیاد بن گئی۔

جون ۱۹۷۶ میں صادقین کی مصوری کی نمائش کے دوران لاہور میں جلسے۔جلوس اور احتجاج ہوئے۔اسی میں بم کے دھماکے بھی ہوئے۔اس ہنگامہ آرائی کے ردِعمل میں صادقین نے جو رباعیات لکھیں وہ ان کی فن کاری کا اعلیٰ اور نادر نمونہ ہیں۔

اے شخص نہ ہابیل نہ قابیل سے پوچھ
دریافت کر قرآن سے انجیل سے پوچھ
لاہوتی صفات ہیں جو میرے فن کی
جبریل واضافیل وسرافیل سے پوچھ

واقف نہ تو بوالہوس نہ اہل کیں ہیں
وہ میرے ایمان پہ نقطہ چیں ہیں
خطاطی وتصویر و رباعی کیا ہیں
یہ حسن پرستی کے اصولِ دیں ہیں

خطاطی میں اک کیف وسرور آتا ہے
وہ حسن بھی لوحوں پہ ضرور آتا ہے
مکھڑوں کے چراغوں کا تصور کر کے
لکھتا ہوں تو تحریر میں نور آتا ہے

صاقین کی بیشتر رباعیات فی البدیہہ کہی ہوئیں ہیں۔ جو انکے مداحوں کی فرمائشوں کے نتیجے میں ہیں۔ اس لئے ان رباعیات کا لہجہ بھی رومانی ہے۔ خود صادقین کے الفاظ میں مہ وشوں اور زہرہ جبینوں کے جھرمٹ میں کسی معصوم کے تقاضوں اور بامعنیٰ اشاروں پر کہی ہیں۔

کب ہیئتِ دو جہاں پہ لکھتے ہم ہیں　　کب صورتِ لامکاں پہ لکھتے ہم ہیں
یہ جو ہیں رباعیاں ہماری اے دوست　　فرمائشِ مہ وشاں پہ لکھتے ہم ہیں

جب ہم پہ کرم ماہ وشاں کرتے ہیں　　اور دل کی ہر اک بات پہ ہاں کرتے ہیں
بس ایسے ہی لمحات میں دل کی شہ سے　　ہم شکرِ خدائے دو جہاں کرتے ہیں

آتے ہیں حسیں ہاتھ میں پھول ہوتا ہے　　روزانہ کوئی تحفہ وصول ہوتا ہے
صورت میں حسینوں کے کرم کی ہم پر　　اللہ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے

اک عالمِ گل فشاں ہے جس میں میں ہوں　　اک حلقۂ مہوشاں ہے جس میں میں ہوں
ہاں چاند ستاروں کی نہیں ہے اے دوست　　مکھڑوں کی یہ کہکشاں ہے جس میں میں ہوں

خلاصہ یہ کہ صادقین بین الاقوامی برادری میں خطوط کی نزاکت۔ دلرباؤں کی رفاقت۔ اور ساتھ ہی مضمون کی قوت کی بدولت شہرت کی معراج کو پہنچے۔ شب و روز خون پسینہ ایک کیا۔ اور

اتنی مصوری کی کہ اگر انکی تمام تصاویر برابر برابر رکھی جائیں تو وہ ایکڑوں پر پھیل جائیں اور اگر خطاطیاں ایک لائن میں رکھی جائیں تو میلوں تک جائیں۔ اور صادقین کی اپنی زبان میں اس بارے میں ایک رباعی ہے۔

دن رات ہو، جب شام یا پو پھوٹتی ہے کنی میرے ہاتھوں سے نہیں چھوٹی ہے
پھر کام سے دکھ جاتا ہے اتنا میرا ہاتھ روٹی کو جو توڑوں تو نہیں ٹوٹتی ہے

لیکن اپنے فقیرانہ انداز اور خود نمائی سے پرہیز کی بدولت صادقین کی رباعیات انکے خاص حلقۂ احباب تک ہی محدود رہیں۔ انکی رباعیات میں آفاقیت پائی جاتی ہے اور وہ آگے بڑھتی ہوئی انسانی تہذیب کی راہ میں جو طاقتیں مزاحم ہوں ان کے خلاف جنگ ہیں۔ سماجی اور معاشرتی منافقین کے ساتھ۔ یا علم و دانش کے منافقین کے ساتھ۔ یا دین و ایمان کے منافقین کے ساتھ جنگ ہیں۔ آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صادقین نے شہرِ لاہور میں کتنے ہی اعتکاف کئے۔ ان کے شاہکار میوزیم۔ لائبریریوں۔ یونیورسٹیوں اور دیگر عمارات میں آویزاں ہیں۔ وہ سب تحفۂ درویش ہیں شہر والوں کو۔ صادقین نے لاہور کے لئے اس رباعی میں خلاصہ بیان کیا۔

شاگرد کسی کا ہوں نہ استاد ہوں میں کرتا ہوا تخلیق اور ایجاد ہوں میں
لیلٰیِ ہنر ہے اگر بنتِ لاہور پھر واقعی لاہور کا داماد ہوں میں

صادقین فاؤنڈیشن

SADEQUAIN Foundation

9415 Maler Road San Diego, CA 92129 U.S.A. www.sadequainfoundation.com

sadequainfoundation@gmail.com PHONE 858-538-1574

درون خانہ

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں، لا اِلٰہ اِلّا اللہ

اقبالؔ

فولاد کی دیواروں سے نہ رکے گا

کب تک رہیں گے یہ دیواروں سے نہ رکے گا

کہنے کا یہ حرفِ حق سنہری موقع

اک شکر گفتار سے نہ رکے گا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اک میرا خیال ہے یہ ممکن ہے نہ ہو خام
یہ میری نظر میں ہے رباعی کا مقام
اصناف سخن میں یہ تو ہے ایسے جیسے
پانی کے کٹوروں کے آگے ہے کا جام جم

ادراک جہاں سے ہے زمانے میں نئے
جذبات و صدا سے ہے زمانے میں نئے
ہر جنس غزل سے آگے رباعی کہئے
اس کی ہر ادا ہے ایسا ہے زمانے میں نئے

عجب پا عیش که و پهنی پا گل شام

منشو با مرا ماه گذشته کا پیه کام

جو نقش تھے پامال بنائے میں نے
پھر اُلجھے ہوئے بال بنائے میں نے
تخلیق کے کرب کی جو کھینچی تصویر
تو اپنے خد و خال بنائے میں نے

اک بار میں ساحری بھی کر کے دیکھوں
کیا فرق ہے شاعری بھی کر کے دیکھوں
تصویروں میں اشعار کہے ہیں میں نے
شعروں میں مصوّری بھی کر کے دیکھوں

ہو

۱ پھر یہ کیا رنگوں کا کھیلا ہے

۲ اُس پتل سے فن کا کھیل کھیلا ہے

۳ اِس اپنے بدن کو بہ غور دیکھو ذرا

۴ تخلیق کے کو دیکھو جس نے پیدا کیا

انجم

عاصی صادقین عفی عنہ

لو۔ وادیِ الہام میں آپہنچا ہے
لو مملکتِ جام میں آپہنچا ہے
مانی بھی اُسی شوخ کا جلوہ کرنے
اب کوچۂ خیّام میں آپہنچا ہے

کرتا ہے یہ شور و شین، آیا کیوں ہے؟
کیا اِس کو نہیں ہے چین، آیا کیوں ہے؟
خیّام نے سرمد سے یہ پوچھا، آخر
اِس کوچے میں صادقین آیا کیوں ہے؟

"یاں شعر ہے اور جام ہے" آئی آواز
"تیرا یہاں کیا کام ہے" آئی آواز
پوچھا ہی تھا اِس گلی کو کہتے کیا ہیں؟
"یہ کوچۂ خیّام ہے" آئی آواز

اُن سے بھلا کس کام سے ملنے پہنچا
تصویر تھا اور جام سے ملنے پہنچا
گھر مانی و بہزاد سے کہہ کر بیٹھو
میں سرمد و خیّام سے ملنے پہنچا

آیا ہوں ہواؤں کے میں زنّاٹے میں
لوگوں کو خبر ہی نہیں خرّاٹے میں
ہوں ڈھول بجا کے شور کرنے آیا
اِس گنبدِ نغمات کے سنّاٹے میں

جنگاہ میں رن ہے یہ بتانے کیلئے
خوابیدہ جو ہیں اُن کو جگانے کیلئے
آیا ہوں بہت دُور سے چل کر شب میں
خیموں میں یہاں شور مچانے کیلئے

کچھ کم یہ جو پڑ رہا ہے جاڑا کر دوں
ترچھے کو نہ گر سیدھا تو آڑا کر دوں
سنّاٹا کہ ہے کوچۂ موسیقی میں
اچھا ہے جو جا کے غُل غپاڑا کر دوں

کب شعر سُنانے کے لئے آیا ہوں
کب گیت میں گانے کیلئے آیا ہوں
میں کوچۂ خیّام کی خاموشی میں
ہڑبونگ مچانے کیلئے آیا ہوں

مَعشوق لئے جام بکف جاتا ہوں
تھم تھم کے بجاتا ہوا دف جاتا ہوں
عُرفی مری بستی میں تھا آیا، اب میں
مَعمورۂ عُرفی کی طرف جاتا ہوں

الوان! میں ترکِ حرم و دیر کروں؟
اِس دل کی بھی حالت کو ذرا غیر کروں
میں قوسِ قزح کے پُل پہ پیدل چل کر
مَعمورۂ ابجد کی ذرا سیر کروں

اے عَالَمِ ابجد! بڑا بانکا میں ہوں
کیا تجھ کو بتاؤں کہ کہاں کا میں ہوں
میں تو ہوں تری سیر کو آیا۔ ویسے
اِک اور ہی دُنیا ہے جہاں کا میں ہوں

وہ درد جسے دل میں ہوں سہنے والا
الوان و خطوط میں ہوں کہنے والا
آیا ہوں تری سیر کو شہرِ ابجد!
میں شہرِ مداد کا ہوں رہنے والا

رباعی

میں کوچۂ رباعی کے جو اندر آیا
جس طرح کہ بن میں رام چندر آیا
تو بولے مدینۂ سخن کے شہری
یہ کون یہاں مست قلندر آیا

اُس رخ میں نئے حسنِ کرم کو دیکھا
اُس زلف میں اک اور ہی خم کو دیکھا
کچھ دیر کو مُو قلم کو رکھ کے میں نے
اک بار اُٹھا کر جو قلم کو دیکھا

پہلے میں رہا کرتا تھا میخانوں میں
پھیلے ہوئے الوان کے میدانوں میں
اب اُن سے نکل کر میں نہ جانے اے دل!
کیوں قید ہوں الفاظ کے تہ خانوں میں

کچھ دن سے شب و روز مجھے ہے یہ جنوں
کس نے یہ کہا تھا، میں بھی سوچتا ہوں
شہراہِ مداد پر رواں تھا۔ لیکن
الفاظ کی اب بھول بھلیوں میں ہوں کیوں

ہو شغلِ مے و جام میں، آوارہ ہو
لگ جاؤ کسی کام میں، آوارہ ہو
اے سیّدِ صادقین احمد نقوی!
کیوں کوچۂ خیّام میں آوارہ ہو

اِس رنگ میں جو کچھ مری تقصیریں ہیں
واقف ہوں، یہ جو کچھ مری تحریریں ہیں
پردہ ہیں۔ پسِ پردہ بتاؤں کیا ہے؟
عمرِ فنی کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں

ہیں گیسو و ابرو کے بھی خم اے یار!
خامے میں ہے مو قلم کا عالم اے یار!
عرفی کم و بیش تھا مصوّر جتنا
اتنا ہی میں شاعر ہوں کم از کم اے یار!

خود تڑپوں گا اوروں کو بھی تڑپاؤں گا
میں شہر میں مانی کے اماں پاؤں گا
خیّام کی بستی سے، سحر ہوتے ہی
کچھ روشنی پھیلے تو چلا جاؤں گا

دو دن کو ہوں اِس شہر میں اشعار کے بیچ
جو کچھ ہے چلا جاؤں گا سب ہار کے بیچ
کرتا ہوں نگارِ شعر! تیری خاطر
معشوقۂ تصویر کا حق مار کے بیچ

نقّاد کی ڈانٹوں میں ہوں اُلجھا ہوا میں
تقطیع کے باٹوں میں ہوں اُلجھا ہوا میں
اِک پھول کے مضمون کی خاطر یعنی
الفاظ کے کانٹوں میں ہوں اُلجھا ہوا میں

فیتے سے عروض باز کیونکر ناپیں
اشعار کا سوز و ساز، کیونکر ناپیں
محبوب کے اعضا کی کریں پیمائش
لیکن وہ ادائے ناز کیونکر ناپیں

بے بہرہ کیا ہے عقل سے قاضی مجھ کو
وجدان نے کیا شعر پہ راضی مجھ کو
میں علمِ عُروض میں ہوں بالکل کورا
یہ علمِ عُروض ہے ریاضی مجھ کو

تعاقبِ نقش و نقاش

یہ تیرا، پری! پیار ہے؟ جس میں، ہیں ہو
اک کرب کی دیوار ہے، جس میں، ہیں ہو
بے چینی کی اِک کھوہ ہے، جس میں دل ہے
تنہائی کا اِک غار ہے، جس میں، ہیں ہو

ہے حور کا یا روحِ نجس کا قبضہ
کتنا ہے مکمل یہ ہے جس کا قبضہ
ویسے ہی تڑپتا ہوں وہ جیسے چاہے
یہ میرے وجود پر ہے کس کا قبضہ؟

یوں کرتی ہوئی جلوہ گری ہے یہ کون؟
پہنے ہوئے پوشاک ہری ہے یہ کون؟
تخلیق کے جن کا جو اثر ہے مجھ پر
ہاں میرے تصور میں پری ہے یہ کون؟

مجھ پر نہیں دیوِ زرگری کا قبضہ
آسیب ہوس کی خودسری کا قبضہ
قابو میں تو جنات ہیں میرے لیکن
مجھ پر ہے کسی سبز پری کا قبضہ

اِس محفلِ نور میں ہوں بالکل مجبور
حوروں کے قصور میں ہوں بالکل مجبور
جنات کے آگے ہوں مکمل مختار
پریوں کے حضور میں ہوں بالکل مجبور

اے شوخ! میں زندگی میں تجھ تک پہنچا
اک عالم سرخوشی میں تجھ تک پہنچا
ہستی کی سیہ رات میں چلتے چلتے
مکھڑوں کی میں روشنی میں تجھ تک پہنچا

اے شوخ! خد و خال بناتا کیونکر!
ظاہر ہے مکان تیرا پاتا کیونکر!
ہوتی جو نہ گیسوؤں کی چھاؤں سر پر
اس دھوپ میں چل کر یہاں آتا کیونکر!

روشن ہے، جو اب ہے حال میرا، تجھ پر
ہاں ختم ہے اب کمال میرا تجھ پر
ہے کتنے ہی گیسوؤں میں ہو کر پہنچا
شانہ بن کر خیال میرا تجھ پر

دل میں ستم ایجاد جو آئی کل رات
لب پر مرے فریاد جو آئی کل رات
میں اپنے فراق میں بہت ہی تڑپا
خود تجھ کو مری یاد جو آئی کل رات

باغی تھا، بغاوت میں تھا اکڑا ہوا میں
زنداں میں تھا لایا گیا پکڑا ہوا میں
پھر توڑ کے آہنی سلاسل کب سے
ہوں زُلف کے اِک بال میں جکڑا ہوا میں

ہاں اُس کی نہ ہے تنگ نہ ڈھیلی پوشاک
عنابی نہ ہے سُرخ نہ پیلی پوشاک
اِک شوخ پری جس کا ہے مجھ پر جادو
پہنے ہوئے رہتی ہے وہ نیلی پوشاک

آکاش کے تاروں پہ ہوں ناچا میں خود
تھیں فرش، بہاروں پہ ہوں ناچا ہیں خود
جنّات کو اُنگلی پہ نچا کر ابی
پریوں کے اِشاروں پہ ہوں ناچا میں خود

اینٹوں کا کھرنجہ ہے کہ جس میں میں ہوں
فولاد کا پنجہ ہے کہ جس میں میں ہوں
اِس کو کوئی کستا ہی چلا جاتا ہے
یہ کیسا شکنجہ ہے کہ جس میں میں ہوں؟

کرتا ہوں کبھی غور، مرے پردے میں
کس کے ہیں یہ سب طور؟ مرے پردے میں
مجھ سے جو کچھ کہ ہو رہا ہے سرزد
کرتا ہے کوئی اور، مرے پردے میں

قرطاس پہ یہاں جلوے دکھاتا ہے یہ کون؟
پردے میں مرے نقش بناتا ہے یہ کون؟
یہ سچ ہے کہ مُو قلم گھماتا میں ہوں
لوحوں پہ مرا ہاتھ گھماتا ہے یہ کون؟

کیسی ہیں جنونِ شوق تری رسمیں
پیمانِ محبت کے، وفا کی قسمیں
خود پر مجھے قابو ہی نہیں ہے بالکل
معلوم نہیں کچھ کہ ہوں کس کے بس میں؟

یہ کونسا وقت ہے کہ جس میں، میں ہوں؟
اِک منزلِ بخت ہے کہ جس میں، میں ہوں؟
یہ کیسا شکنجہ ہے کہ جس میں دل ہے؟
یہ کس کی گرفت ہے کہ جس میں، میں ہوں؟

اِک صورتِ بے نام کو دیکھا میں نے
پھر صبح نہ پھر شام کو دیکھا میں نے
جب گردشِ ایّام سے باہر جا کر
اِس گردشِ ایّام کو دیکھا میں نے

کیا رائے ہے؟ ہاں اے دلِ ناداں! کہیئے
اب مجھ سے "چلیں سوئے بیاباں" کہیئے
اِس شہرِ شب و روز کے نقشے میں نہیں
وہ کوچہ جسے کوچۂ جاناں کہیئے

اِن اپنے شب و روز میں جیسے میں ہوں
سچائی کی جستجو میں کیسے میں ہوں!
ویرانۂ نجد میں تھا جیسے مجنوں
لمحات کے صحرا میں کچھ ایسے میں ہوں

اے دوست! اندھیرے میں کہ تو سوتا ہے
اور کھیت اُجالا ہو تو پھر بوتا ہے
ہے تیرا برس تین سو پینسٹھ دن کا
اور میرا اِک ہی سال کا دن ہوتا ہے

پھانکی ہے محبّت کی جو شکّر میں نے
آرام پہ ماردی ہے ٹھکّر میں نے
پھر خانۂ تقویم سے باہر جا کر
دیکھا ہے شب و روز کا چکّر میں نے

شب بھر نہیں سوتا ہوں کوئی کیا جانے
اور موتی پروتا ہوں کوئی کیا جانے
سو جاتی ہے جب ساری یہ دنیا پھر بھی
جاگا ہوا ہوتا ہوں کوئی کیا جانے

آرام سے بھاگ کر گزارا میں نے
دنیا کو تیاگ کر گزارا میں نے
ہر دن کو مصیبت سے ہے کاٹا اور پھر
ہر رات کو جاگ کر گزارا میں نے

بیداری سے اپنا کہ ہے رشتہ راتو!
کیسا ہے محبّت کا نوشتہ راتو!
بولو کہ میں سویا ہوں کبھی بھی تم میں
اے میری جوانی کی گزشتہ راتو!

جاری ہو اگر شدّتِ تخلیق کا دَور
مت پوچھ، مری جان! تو اُس وقت کے طور
جو بندۂ اللہ پر گزری وہ سب
اللہ ہی جانتا ہے ورنہ کون اور!

آغاز کہ انجام، جہاں سے پوچھو
یہ قصّہ کہیں سے، درمیاں سے پوچھو
تخلیق کے کرب کی جو شدّت ہم پر
گزری ہے وہ اللہ میاں سے پوچھو

لکھنے ہیں شب و روز فسانے کیا کیا!
دن رات نقوش ہیں بنانے کیا کیا!
عاشق ہوں تو جانِ ناتواں کو میری
کم وقت میں کرنا ہے نہ جانے کیا کیا!

تخلیق کا دیکھا نہ ظہور اب تک
اِک نقش بھی ہو سکا نہ پورا اب تک
ہاں وقت گزرتا ہی چلا جاتا ہے
اور میرا ہے ہر کام ادھورا اب تک

۱۵

اک نقشِ جلی کھینچ رہا ہے نقاش
کب خونِ جگر بھینچ رہا ہے نقاش
زرخیز ہو، یہ سوچ کے، خونِ دل سے
صحرا کی زمیں سینچ رہا ہے نقاش

موقع نہ تھا اور نقش بنایا میں نے
پھر اُس میں لہو اپنا لگایا میں نے
یہ سوچ کے سیراب ہو، دل کا سب خون
کل ریت کے ٹیلوں پہ بہایا میں نے

آرام سے ہاں بھاگ کے کاٹی اب تک
اور سامنے بس آگ کے کاٹی اب تک
میں نے تری خدمت میں، نگارِ بے نام!
ہر رات کہ ہے جاگ کے کاٹی اب تک

وہ زلف جو تھی اور سنواری میں نے
وہ شکل جو تھی اور نکھاری میں نے
اِس عمرِ عزیز کی تو اب تک ہر آ
جاناں ہی کی خدمت میں گزاری میں نے

نقّاشی نہ جانے ہے مرادیں کب سے؟
فرہاد ہوں میں اور یہ ہے شیریں کب سے؟
ہے حافظہ اچھا یہ نہیں ہے یہ یاد
ہیں خونِ جگر میں ہاتھ رنگیں کب سے؟

شعلہ ہے، شرارہ ہے، چھلاوا کیا ہے؛
جو چھوٹتا دل میں ہے وہ لاوا کیا ہے؛
اِس کو ہی بہاتا ہوں، مَتاعِ عاشق
ہے خونِ جگر اِس کے علاوہ کیا ہے

منقوش کیا زلف کے خم کو میں نے
کچھ بخش کیا صورتِ کم کو میں نے
اور جب بھی ڈبویا تو ڈبویا ہر بار
دل ہی کے لہو میں موقلم کو میں نے

کیوں حسن کو خریدتے ہو زر سے اپنے
حاصل کرو اہلِ ذوقِ نظر سے اپنے
کب پاؤں کے میل سے بنائی میں نے
تصویر بنی خونِ جگر سے اپنے

آوارہ بہت کیا ہے میں نے خود کو
دیوانہ بنا لیا ہے میں نے خود کو
تخلیق کی چکّی ہیں تمہارے آگے
ہاں پیس کے رکھ دیا ہے میں نے خود کو

اِک رازِ دلی کھول رہا ہوں کب سے
نظروں میں اُسے تول رہا ہوں کب سے
تخلیق ہے اِک زہر کہ جس میں خود کو
کچھ یاد نہیں گھول رہا ہوں کب سے

تھی تیغِ جمال کی قیامت کی جو کاٹ
دِکھلائے ہیں پھر عشق نے کتنے مجھے گھاٹ
یہ کربِ وجود و اضطرابِ تخلیق
دانہ ہوں تو گردش میں چکّی کے ہیں پاٹ

جب دل میں ہر اِک درد کو پالا میں نے
شہکار کو سینے سے نکالا میں نے
اِک کربِ وجود ہے کہ جس کو پیہم
اِن نقش و نگار میں ہے ڈھالا میں نے

پیچیدہ سے رستوں سے نہ پوچھو لوگو
برسات میں مستوں سے نہ پوچھو لوگو
"کیا مقصدِ زندگی ہے؟ جیتے کیوں ہو؟"
ہم حسن پرستوں سے نہ پوچھو لوگو

شعلہ کسے کہتے ہیں؟ چھلاوا کیا ہے؟
ہم یوں ہی چلے جائیں، بلاوا کیا ہے
ہاں مسلکِ زندگی ہمارا اسے دوست!
اک حسن پرستی کے علاوہ کیا ہے؟

کرتے ہوئے کچھ غور نہیں لکھ سکتے
کھاتوں میں بہر طور نہیں لکھ سکتے
مکتوبِ محبت کے علاوہ یعنی
عاشق جو ہیں کچھ اور نہیں لکھ سکتے

وہ سمت کہ جس میں وہ حسیں ہے معلوم
وہ قصر کہ جس میں وہ مکیں ہے معلوم
بس کوچۂ جاناں کے علاوہ ہم کو
کچھ شہر کے نقشے میں نہیں ہے معلوم

پھر مجھ میں نہ تھی ضبط کی طاقت تڑپا
جب موڑ پہ پہنچا تو بہ شدّت تڑپا
میں کوچۂ جاناں سے نکل کر دو گام
اِک ماہیٔ بے آب کی صورت تڑپا

ہم کچھ بھی تو خاطر میں نہیں لائیں گے
دیوار کے سائے میں اماں پائیں گے
ہم کوچۂ جاناں سے، نکلتے ہی اگر
مل جائے خدائی تو نہیں جائیں گے

یہ مسئلہ کب ہے کہ کدھر جائیں گے
زندہ نہیں جائیں گے اگر جائیں گے
ہم کوچۂ جاناں سے، یقیں تو مانو
جیسے ہی کہ نکلیں گے تو مر جائیں گے

بھولے سے کبھی اور کہیں ہوتے ہیں
بے سایۂ دیوار، نہیں ہوتے ہیں
ہم۔ کوچۂ جاناں کے علاوہ بھی کہیں
ہوتے ہیں؟ کبھی بھی تو نہیں ہوتے ہیں

کہتا تھا مُصوّر کہ محبّت دی تھی
جو دل میں تھی میں نے اُسے صورت دی تھی
اک لوح کی سادگی نے بڑھ کر میرے
کل حسنِ تصوّر کو جو دعوت دی تھی

نقاش یہ بولا کہ میں بنجارا تھا
پھر رک گیا، چلنے کا کہاں یارا تھا
اک لوح کی سادگی نے آگے بڑھ کر
جب میرے خیالات کو للکارا تھا

نقّاش نے کھینچی ہے سنبھل کر تصویر
اک پُل پہ خیالات کے چل کر تصویر
قرطاس پہ، مستانہ خرامی کر کے
آئی ہے درِ دل سے نکل کر تصویر

تنہا ہے مری ذات، نظر آتی ہیں
کرتی ہوئی کچھ بات، نظر آتی ہیں
ہاں پردۂ خلوت پہ نہ جانے کس کی
پرچھائیاں ہر رات، نظر آتی ہیں

اپنا ہی وہ فاش راز کرکے آئی
اِک صورتِ سوز و ساز کرکے آئی
قرطاس پہ، نقّاش کے دل سے یعنی
تصویر خرامِ ناز کرکے آئی

اشکال، تصوّر میں وہ کرتی ہیں طواف
کچھ نقش نظر آئے ہیں بالکل ہی تو صاف
سائے ہیں خیالات کے پیہم جنبان
نقّاش کے سامنے ہے لوحِ شفّاف

کہتا ہے مصوّر کہ ہیں گھاتیں کیا کیا؟
نقّاشی میں کاٹ دی ہیں راتیں کیا کیا؟
ہر رات، خیالات سے میرے کی ہیں
قرطاس کی سادگی نے باتیں کیا کیا!

اشکال کو خود تول رہا ہے قرطاس
تصویر کا در کھول رہا ہے قرطاس
ہاں اپنی سپیدی کی زباں سے یعنی
نقّاش سے کچھ بول رہا ہے قرطاس

ہم لوگ ہیں اعتکاف کرنے والے
نظارہ بہت ہی صاف کرنے والے
ہیں دیکھ کے برقعے میں سے نکلا ہوا ہاتھ
اندازۂ حسنِ ناف کرنے والے

پوشاک کی لہروں میں تھا نقشِ خفی
کرنے کو جلی میں نے وہیں قلبِ صفی
کیا حسن تھا جب اس کی مساوات سے کل
ملبوس کی کر دی تھی خیالوں میں نفی

محفل میں ادا نماز کر لی میں نے
وہ چشم تھی نیم باز، کر لی میں نے
فیتے سے نگاہ کے جو اک ہی پل میں
پیمائشِ جسمِ ناز کر لی میں نے

ہر عقدہ خیالات میں کھولا میں نے
ہر موتی، تصور ہی میں رولا میں نے
کل اس کی نگاہ سے بچا کر، اس کو
نظروں کی ترازو میں جو تولا میں نے

جب اپنے خیالات کو ہانکا میں نے
پایا۔ جسے دیکھا اُسے بانکا میں نے
اِک غول حسینوں کا تھا بالکل عریاں
کل اپنے دماغ میں جو جھانکا میں نے

کچھ لگتی ہوئی عمر سے چھوٹی وہ تھی
پتّے پہ کوئی ریر بہوٹی وہ تھی
چادر پہ خیالات کی میرے، کل شب
پیکر پہ لگا کے رنگ لوٹی وہ تھی

جب نکلا وہ ہر پرت سے، دیکھا میں نے
نظروں کی ہر اک صفت سے، دیکھا میں نے
اپنے ہی خیالات کے آئینے میں
کل حسن کو شش جہت سے دیکھا میں نے

موتی جو ہیں سب رول چکی ہیں نظریں
محفل میں تجھے تول چکی ہیں نظریں
چٹکی سے تصوّر کی، یکایک تیرے
سب بندِ قبا کھول چکی ہیں نظریں

یہ دائرے اطفال کے گوناگوں ہیں
اطراف میں، چوٹی کے نہ نکلے، یوں ہیں
اِن تیرے خطوطِ تن میں لیکن اک شوخ
یہ میرے خیالات مُقیّد کیوں ہیں؟

گم ہوں میں ترے حُسن کی رعنائیوں میں
ہوں غرق اُبلتی ہوئی انگڑائیوں میں
اور میرے تصوّر کی ہے گردش جاری
تیرے تنِ شفّاف کی گولائیوں میں

خوشبو ہی اگر آئے تو چکھ لیتے ہیں
نادر ہو تو دل میں اُسے رکھ لیتے ہیں
ہم حسنِ خد و خال و قد و قامت کو
پرچھائیں بھی دیکھیں تو پرکھ لیتے ہیں

جو حسن کے بازو ہیں وہ کیسے ہونگے؟
جو زاویئے ہر سُو ہیں وہ کیسے ہونگے؟
اِک رُخ بھی جو دیکھیں تو سمجھ لیتے ہیں
ہم، اور جو پہلو ہیں وہ کیسے ہونگے

فانوس کی روشنی میں جھلکی پوشاک سے
اور جب تنِ شفّاف سے ڈھلکی پوشاک سے
سائے ترے اعضا کے ترے اعضا پر
نظروں میں رہی وہ بھی تھے ہلکی پوشاک سے

بے حد تھا کرم اُس کا مرے حال پہ رات
نظریں تھیں جوانی کے خد و خال پہ رات
فانوس کا زاویہ تھا ایسا، اُس کے
اِک گال پہ دن تھا تو تھی اِک گال پہ رات

نقاش نے، قرطاس سے رہ کر کچھ دور
کل، تیرے وجود کو جو سوچا بھرپور
اعضائے سمودار کی گولائی کے
بازو میں جو ظلمت تھی تو پہلو میں تھا نور

جس وقت کہ فانوس بجھایا میں نے
پھر تجھ کو بھی خلوت میں نہ پایا میں نے
ٹھیری ہوئی تیرگی میں، دھیرے دھیرے
محسوس کیا پھر ترا سایا میں نے

قرطاس پہ جب رنگ لگایا میں نے
خود اُس کی شباہت کو نہ پایا میں نے
وہ ویسی ہی ہو گئی جو دیکھا اُس نے
تصویر میں جیسا تھا بنایا میں نے

اک شوخ کہ خورسند ہوئی تھی وہ خود
نقّاش کی دل بند ہوئی تھی وہ خود
تصویر نہ بن سکی جو اُس کی جیسی
تصویر کے مانند ہوئی تھی وہ خود

تصویر جو کل اُس کی بنائی میں نے
کچھ فرق تھا جب اُس کو دکھائی میں نے
تصویر کے ہو گئی مُطابق وہ خود
اُس شوخ میں اچھی بات پائی میں نے

تصویر میں ملتی نہیں صورت تیری
تصویر میں کچھ اور ہے رنگت تیری
تصویر کے تو خود ہی مشابہ ہو جا
تصویر میں گر نہیں شباہت تیری

دھڑ تیرا، جو تُکمہ تو نے کھولا اے شوخ!
باریش ہے، اک ایسا ہے چہرہ اے شوخ!
سینہ ترا آنکھیں سا نظر آتا ہے
محرم کو سمجھ رہا ہوں چشمہ اے شوخ!

ہاں اوج پہ حسن ہے حسینہ تیرا
ہاں رشکِ گلاب ہے پسینہ تیرا
نیلا پیلا ہے، گھورتا ہے مجھ کو
آنکھیں نظر آتا ہے یہ سینہ تیرا

جب حسن تھا بے ردا مجھے تھی تشویش
ہیں راز کی، دھڑکے، کر رہا تھا تفتیش
سینے کی تھیں گولائیاں آنکھیں اور پھر
پڑو کے تلے بال تھے جیسے کہ ہو ریش

بازو کی طرح سینگ کا خم تھا گویا
سینہ تھا کہ آنکھوں کا تھا نقشہ گویا
جب بندِ قبا کھول کے انگڑائی لی
دھڑ کو طوطے بیل کا تھا چہرہ گویا

تم ہو کہ ہو محفلِ نجوم و مہ میں
کیچڑ کا ہے انبار ہماری رہ میں
مینار کے ساکنو! نکل کر دیکھو
کنڈی میں ہے لوتھڑا گٹر کی تہ میں

سچائی کی وادی کے ہیں رہنے والے
ہیں جملہ نجاسات میں بہنے والے
رازِ عالمِ بالا کا نہیں کہتے ہیں
ہم تو ہیں گٹر کی بات کہنے والے

ہم نالے پہ کاٹتے ہیں راتیں، اے یار!
کیوں ہم سے یہ کر رہے ہو گھاتیں، اے یار!
ہم تو ہیں گٹر میں غرق، ہم سے مت چھیڑ
یہ کوثر و تسنیم کی باتیں، اے یار!

مرمر کے مناروں میں ہے جن کا مسکن
سچائی اور اُن کے درمیاں ہے چلمن
ہم گند کے نالے میں پڑے ہیں، ہم پر
ہے عالمِ بالا کی حقیقت — روشن

مینار کے ساکنو! صداقت میں ہوں
جس سے تمہیں گھن آئے وہ حالت میں ہوں
یہ زندگی کیچڑ ہے تو اس کیچڑ میں
سارا ہی سنا ہوا ہوں، غلاظت میں ہوں

خوابوں کے نظاروں سے نکل کر آؤ
گمنام ستاروں سے نکل کر آؤ
ہاں تم بھی جہاں میں ہوں، گٹر ہے یعنی
مرمر کے مناروں سے نکل کر آؤ

کیا وقتِ سحر، شام ڈھلے بھی آؤ
گھنیاؤ گے، شاخوں کے تلے بھی آؤ
افسانوں کی تہ نشیں سے نکلو اک بار
نالے پہ حقیقت کے چلے بھی آؤ

عبرت کے مناظر ہیں سنبھل کر دیکھو
اس تنگ و طویل پل پہ چل کر دیکھو
کیا ٹھوس حقائق کا ہے عالم اک بار
تم خواب کی دنیا سے نکل کر دیکھو

ہے ذوقِ جمال کو جگانے کیلیئے
یہ چیز، دلوں میں ہے سمانے کیلیئے
کس سے کہوں؟ تصویر نہیں ہوتی ہے
عشرت گہِ زردار سجانے کیلیئے

سیٹھوں کے مکانات میں کب ہیں استادو!
ایسے بُرے حالات میں کب ہیں استادو!
ہیں لائبریریوں میں مرے شہکار
سٹّے کی عمارات میں کب ہیں استادو!

ہاں لائبریری میں بنائے میں نے
شہکار مدرسے میں لگائے میں نے
عیاش جہاں جاتے ہیں رنڈی لیکر
کب ایسے مقامات سجائے میں نے!

جو غیر کی ہیں، اسی حدوں میں کب ہیں!
نیکوں میں ہیں استادو بدوں میں کب ہیں!
میری تو مدرسوں ہی میں تصویریں ہیں
میخانوں میں اور عیش کدوں میں کب ہیں!

میں خانۂ زردار سجاؤں کیسے؟
افسانہ، حقیقت کو بتاؤں کیسے؟
موجود ہیں یہ زندہ خار، آخر تصویر
اِن کاغذی پھولوں کی بناؤں کیسے؟

ہم اپنے ہی دل کا خون بہانے والے
اک نقشِ محبّت ہیں بنانے والے
عشرت گہِ زردار میں کھینچیں تصویر؟
ہم کوچۂ جاناں کے سجانے والے

خون اپنا بہانے کو ہے حاضر فنکار
اِس بات پہ لیکن وہ نہیں ہے تیّار
جاسوس جہاں کھیل رہے ہوں پتّے
ہو ایسی کمیں گاہ میں اُس کا شہکار

کر کے کوئی تدبیر نہیں کھینچنے کا
نقش ایسا یہ دلگیر نہیں کھینچنے کا
رانی کی بناؤں گا کہ مہ وش وہ ہے
راجہ کی میں تصویر نہیں کھینچنے کا

سختی سے چٹانوں کی نہ ہمت ہارا
پھر موم سے بھی نرم تھا سنگِ خارا
چھوٹا وہیں فوّارۂ آبِ شیریں
کل سنگ پہ پھاوڑا جو میں نے مارا

اجمال ہے، کیا اِس کی ضروری تفصیل
کی عقل نے، ایجاد کی روشن قندیل
اِک چوٹ ہتھوڑے کی جو کھا کر لوہا
نازک سی مشینوں میں ہوا ہے تبدیل

جب ہاتھ سے خود گلاب کھویا میں نے
کاندھوں پہ پھر اِک پہاڑ ڈھویا میں نے
گر کچھ بھی نہیں ناگ پھنی تو ہوگی
صحرا میں چھوئی موئی کو بویا میں نے

وہ سامنے تیرے پھر ہے لوحِ صحرا
تعمیر پہ اب مُصِر ہے لوحِ صحرا
اِک شہر کی تصویر بنائے آکر
نقاش کی مُنتظر ہے لوحِ صحرا

اِس میں ہی مجھے طُور نظر آتا ہے
یعنی کہ رُخِ حُور نظر آتا ہے
اپنے اِسی بیلچے کے پھل کے اطراف
اِک ہالۂ پُرنور نظر آتا ہے

میں نے جو سرِ شام تھکا تھا ہارا
افلاک پہ کل دیکھ کے اونچا تارا
مِرّیخ کو تاکتی مشینیں نکلیں
جیسے ہی کُدال کو زمیں پر مارا

وہ سرو کے سِلسلے کنارِ گلزار
ہیں خوب، مگر اُن سے ہیں بڑھ کر ضوبار
یہ تا بہ اُفق ہے جو کرینوں کا سماں
یہ حدِ نظر تک جو ہے کھمبوں کی قطار

کل شہر بیاباں میں نظر آئے گا
صحرا میں مرا دل نہیں گھبرائے گا
اور وہ جو ہے اِک سراب، اِک دن اُس کو
اِک جھیل میں تبدیل کیا جائے گا

گل داں کے بانی ہیں یہ نازک بیلیں
صدمے جو حیات کے ہیں کیسے جھیلیں؟
کلیوں سے کریں چھیڑ، یہ ان سے کہہ دو
صحرا کے، نہ یہ ناگ پھنی سے کھیلیں

تصویر تھی دیوار پہ سن کر حیران
گندھارا کے گوتم کے کھڑے ہو گئے کان
بولی کسی گل داں میں نازک ٹہنی
صحرا کے نہیں ناگ پھنی میں کچھ جان

گل داں کی بیلوں کو یہ یارا کب ہے؟
منظور انہیں نام ہمارا کب ہے؟
صحراؤں میں ہاں ناگ پھنی بھی ہو کر
جینا جو ہمارا ہے گوارا کب ہے؟

اک سایۂ گل میں گیت تم نے گایا
سب کچھ ہی کیا، چین نہ میں نے پایا
میرے تو خیالات پہ جانے کب سے
ہے پھیلا ہوا ناگ پھنی کا سایا

اِس شہر کو جب یاس سے دیکھا میں نے
ہر شے کو بڑی یاس سے دیکھا میں نے
بالکل ہی تو لق و دق بیابان پایا
جب شیشۂ احساس سے دیکھا میں نے

شاخوں میں ہے اک کوہ کنی کا انداز
کانٹوں میں ہے نیزے کی انی کا انداز
اِس شہر میں اپنا بھی وہی ہے تیور
صحرا میں ہے جو ناگ پھنی کا انداز

واقف ہو کہ میں دل کا غنی ہوں یارو
اِک فلسفۂ کوہ کنی ہوں یارو
تم شاہ نشیں میں ہو رجز کا اِک پھول
صحراؤں میں، میں ناگ پھنی ہوں یارو

سرشارِ مئے عشق جو پی کر میں ہوں
خوش جتی کی تلاش میں جو جی کر میں ہوں
گلدان میں کاغذ کے یہ پھولوں سے کہو
جنگل میں جو کیکر ہے وہ کیکر میں ہوں

اُس دن سے لگا لیا ہے تالا مُنہ پر
اِک راز تھا آنے کو نرالا مُنہ پر
کہنے کو کبھی ہونٹ تھے کھولے لیکن
اب مکڑی کا بن چکا ہے جالا مُنہ پر

ڈر تھا کہ زمیں پر وہ گرے گا دھب سے
سر ہم نے ہلایا نہیں اپنا تب سے
بُت کی طرح جامد ہیں ہمارے سر پر
اُلّو نے ہے گھونسلا بنایا جب سے

ڈالے ہیں بھلا کس نے یہ گھیرے سر پر
پھیلے ہیں مہیب سے اندھیرے سر پر
اِک ٹھنٹھ پہ اُلٹی ہوئی ہنڈیا پہ ہے تاج
اِک زاغ ہے بیٹھا ہوا میرے سر پر

پھر پاؤں پہ گر کے آہ بھرتا میں ہوں
کہتا ہوں تری چاہ میں مرتا میں ہوں
خود کھیت میں اک ٹھنٹھ پہ ہنڈیا رکھ کر
پھر اُس سے ہی بڑھ کے عشق کرتا میں ہوں

ہونٹوں پہ جو سسکتے ہوئے تارے دیکھے
اجسام کے حالات نرالے دیکھے
اعضا کے جو مابین خلا ہے اُس میں
مکڑی کے لگائے ہوئے جالے دیکھے

اِس کھیت میں غم سے مر رہا ہوں خود ہی
زخمی خود کو میں کر رہا ہوں خود ہی
کوؤں کے اُڑانے کو بنائی اِک شے
میں نے، میں اُسی سے ڈر رہا ہوں خود ہی

اپنا ہوں گرو اپنا ہی چیلا میں ہوں
پرچھائیوں کا رُکتا ریلا میں ہوں
خلوت کی پُراسرار سی تنہائی میں
سایوں کے ہجوم میں اکیلا میں ہوں

خود اپنے وجود کو دبوچا کیوں تھا؟
خود اپنے ہی بازوؤں کو نوچا کیوں تھا؟
خود اپنے ہی انفاس کو سُن کر، میں نے
خلوت میں ہے یہ کون؟ یہ سوچا کیوں تھا؟

وہ شوخ کہ میں جس کا ہوں دل سے قائل
ہاں پورے وجود سے ہوں جس پر مائل
گنجان سی خاردار تاریں، لیکن
میرے اور اُس کے درمیاں ہیں حائل

میں خون میں ہاں لتھڑا ہوا پہنچا ہوں
زخموں کی میں تصویر بنا پہنچا ہوں
کانٹوں والے تھے تار جن سے ہو کر
میں منزلِ محبوب تک آ پہنچا ہوں

محفل میں نہ ساقی نہ نگاریں دیکھیں
گلزار میں نکلا نہ بہاریں دیکھیں
جب سبھی سے نظر اُٹھائی میں نے، اپنے
اطراف میں خاردار تاریں دیکھیں

دشمن ہوں وہ یا ہوں یار، میں نے دیکھا
کرتے نہیں اعتبار، میں نے دیکھا
افراد کے درمیان حائل، یعنی
کانٹوں والے ہیں تار، میں نے دیکھا

جاناں کے خیال کو میں چھوڑوں کیسے؟
یہ تار جو سامنے ہیں موڑوں کیسے؟
میں توڑ کے زنداں کی سلاخیں نکلا
اب مکڑی کا جالا ہے یہ توڑوں کیسے؟

آہن کی سلاخیں وہ فصیلیں سنگیں
زنداں میں تھا میں، ترے لئے یقیں توڑیں
ہم دونوں کے درمیاں حائل اب ہے
اِک مسکنِ عنکبوت، جانِ شیریں!

رستہ میں وہاں راجہ کو سختی جھونجل پہنچا
گو پاؤں میں چھالے تھے ہیں اوّل پہنچا
کانٹوں پہ بہاتا ہوا خونِ دل کو
میں منزلِ جاناں پہ ہوں پیدل پہنچا

تم سیج پہ پھولوں کی ہو اوّل شب سے
واقف ہو فقط عیش و طرب کے ڈھب سے
گنجان ہے کیکروں کا جنگل جس میں
عاشق ہے لہولہان جانے کب سے!

عزت کی پگھل جائے گی اک دم زنجیر
مجھ کو وہیں مل جائے گی فوراً جاگیر
گر خونِ حسینؑ سے، محل میں جا کر
لوحوں پہ، یزید کی بناؤں تصویر

انعام میں پھر دولتِ دنیا پاؤں
ہیروں کے ہوں انبار جو واپس آؤں
تصویرِ سرِ حسینؑ کھینچوں اور پھر
خدمت میں یزید کی میں لیکر جاؤں

اس خون کو اے صادقینؔ! اور میں بیچوں؟
اس خون سے کشتِ حسن اور میں سینچوں؟
کرنے کو یزید کی طبیعت کچھ خوش
تصویرِ سرِ حسینؑ اور میں کھینچوں؟

جو بات نہیں دل میں، سناؤں کیسے؟
جو نقش نہیں دل میں، بناؤں کیسے؟
مقتل کو منقش کروں خونِ دل سے
دربار کو میں جا کے سجاؤں کیسے؟

ہیں فیلِ ہوس پہ دِل کو ہودہ کرلوں
سرسبز وہیں حرص کا پودا کرلوں
زردار کی گر دولتِ ناجائز ہیں
قرآن کی آیات کا سودا کرلوں

خطاط ہوں، مُعتبر مجھے ہے تشدید
اِک صورتِ راہبر مجھے ہے تشدید
زیر و زبر و نقطہ و پیش و مرکز!
تم سے بھی عزیز تر مجھے ہے تشدید

میخواری کہ عصیاں ہے تمھارے نزدیک
اور پاس مُصلّیٰ ہے ہمارے نزدیک
جس حرف پہ چاہیئے لگانا تشدید
بھولیں تو گناہ ہے ہمارے نزدیک

کرتی جو تمیز ہے تو وہ ہے تشدید
واجب جو چیز ہے تو وہ ہے تشدید
زیر و زبر و پیش ہیں، سب سے بڑھ کر
مجھ کو جو عزیز ہے تو وہ ہے تشدید

ہاں سمجھا ہے جس کسی کو دیکھا میں نے
تجھ تک جانے کا اِک وسیلہ میں نے
اے شوخ! ترے واسطے، تیری خاطر
کتنے ہی حسینوں کو ہے پوجا میں نے

انداز میں ہاں جھوم رہی تھی اپنے
پھر ہاتھ وہ خود چوم رہی تھی اپنے
کہہ کر کہ "مدار پر نہ گھومو" مجھ سے
محور پہ وہ خود گھوم رہی تھی اپنے

تم سے ہوں میں مختلف قرینے والا
ہوں اور ہی انداز سے جینے والا
پیمانۂ بِلّور میں سوڈا تو نہیں
شمپین کٹورے میں ہوں پینے والا

ہیروں کے بکھیرنے کو دل جو کھولا
ہر شخص "یہ ٹھیکرے ہیں" اتنا بولا
اُس بزم میں ہم خونِ جگر لائے ہیں
سب کو جہاں مرغوب ہے کوکو کولا

تاریخ بڑھی ۔ وقتِ رواں کے بن میں
راہوں میں گڑھے کھودے ہیں، ناگن پن میں
جس طاقتِ رجعت نے، اُسی کے تو خلاف
ہے جنگ کا اعلان ہمارے فن میں

دونوں ہی بلند ہیں تو دونوں ہی ہیں پست
دونوں کا برا حال ہے، دونوں ہی ہیں مست
موضوعِ سخن مجھ میں ہے اور میں خود بھی
موضوعِ سخن میں ہو گیا ہوں پیوست

یہ تا بہ اُفق ناگ پھنی کا جنگل
میں اِس میں منا رہا ہوں کب سے منگل
تخمینے کی شاخوں پہ کہیں بیٹھ کے تم
ہو دیکھتے اک سود و زیاں کا دنگل

گر ترکِ محبت کی جزا ہیں توڑے
گر جرمِ محبت کی سزا ہیں کوڑے
کوڑے ہمیں منظور ہیں، ورنہ دل میں
سرطانِ جمود کے پڑیں گے پھوڑے

تہذیب اخلاق

بیچ چوراہے پہ ننگا ناچ

تہ میں جو حقیقت ہے، بتاتی ہے مجھے
عبرت کے مقامات دکھاتی ہے مجھے
چوراہے پہ پردے کی وہ بن کر تبلیغ
ہر شے یہیں برہنہ نظر آتی ہے مجھے

دیکھا جب مجھے وہ بولے یہ سینہ شق ہے
مجذوب ہے، مجنون ہے، مستغرق ہے
یہ کون قلندر ہے کہ آگے بڑھ کر؟
باطل کے جو ماحول میں کہتا حق ہے

ہوں کفر کے دربار میں پڑھنے والا
باطل کی ہوں دیوار میں پڑھنے والا
میں اور کہیں تو کیا یہ حق کا کلمہ
ہوں نرغۂ کفار میں پڑھنے والا

مسند پہ کتابِ دین رکھی تھی، اِک پیر
اخلاق پہ کر رہا تھا کب سے تقریر
پھر میں نے بھی مسند کو وہیں سے کاٹا
مسند کے تھی نیچے جہاں ننگی تصویر

کچھ ہم کو منافقوں سے شکوہ کب ہے
اُس سانچے سے البتہ ہے، روز و شب ہے
جس سے کہ یہ کردار ہیں ڈھل کر نکلے
اِک جنگ معاشرے سے اپنی، اب ہے

جائز نہیں، اے اہلِ مدینہ! ہے حرام
پوشاکِ طربناک کا پہننا ہے حرام
خود اپنے لبادے میں چھپا کر بوتل
اوروں سے یہ کہتا ہوں کہ پینا ہے حرام

جو نیک تھا وہ کام دکھایا میں نے
جس کو نہ تھا معلوم بتایا میں نے
اور جو مرے کرتوت تھے اُن کو اپنی
دستارِ فضیلت میں چھپایا میں نے

ہے ہاتھ میں تسبیح، زباں پر تکبیر
اخلاق پہ کرتا ہوں مُدلّل تقریر
پردے کی میں کر رہا ہوں کب سے تبلیغ
سینے سے لگائے ہوئے ننگی تصویر

سب سمجھے کہ ایمان ہے میرے دل میں
گو اُس کا ہی فقدان ہے میرے دل میں
اللہ ہی اللہ ہے میرے لب پر
شیطان ہی شیطان ہے میرے دل میں

ظاہر میں تو میں باندھنے صف آیا ہوں
اس پردے میں شمشیر بکف آیا ہوں
ہوں کفر کا جاسوس، منافق بن کر
میں خیمۂ ایمان کی طرف آیا ہوں

لالچ کے گٹر میں نے اُلیچے کیا کیا
کھولے ہیں ہوس کے بھی دریچے کیا کیا
یہ کس کو ہے معلوم، مجھے ہے معلوم
ہاں اِس مری مسند کے ہے نیچے کیا کیا

جو داغ تھے، دن رات چھپائے میں نے
گندے تھے جو حالات چھپائے میں نے
تقدیس کی گفتگو کی چادر لے کر
دامن کے نشانات چھپائے میں نے

دل کو نہیں، چہرے کو نکھارے نکلا
دریائے ہوس کے بھی کنارے نکلا
حمّام میں کچھ دیر رہا تھا جو ذرا
اور روپ مسیح کا وہ دھارے نکلا

حجرے میں فقیہوں کی فقہ جاری ہے
وہ آج جو آئی ہے بڑی پیاری ہے
اور اُس کو چھپا دیا ہے اِس کے پیچھے
یہ قلمی کتابوں کی جو الماری ہے

پردہ ہے حجاب ہے۔ وہ چہرہ کب ہے
دھوکہ ہے سراب ہے۔ وہ چہرہ کب ہے
سب جس کو سمجھ رہے ہیں میرا چہرہ
چہرے پہ نقاب ہے۔ وہ چہرہ کب ہے

شیطان لگائے ہوئے غازہ نکلا
کندھا دینے کو کفرِ تازہ نکلا
معشوقۂ ایماں کے گلی کوچوں سے
جب میرے ضمیر کا جنازہ نکلا

سایہ جو کئے تھا پیڑ میں نے دیکھا
جذبات نے دی جو آڑ میں نے دیکھا
پھر میری ہوس کے بھیڑیئے کے آگے
تھا میرا ضمیر بھیڑ میں نے دیکھا

تم میں ہر اِک اللہ سے ڈرنے والا
ایمان کے نام پر ہے مرنے والا
اِس دورِ مُنافقت میں اِک میں، یارو!
ہوں کُفر پہ اپنے ناز کرنے والا

ہے لمبی اُس آستین میں شاطر پکّا
اور میں کھُلے بندوں کہ ہوں مُنکر پکّا
سَر پَر ہے مرے جَبَل، بچاری ہیں ہوں
میں ڈنکے کی چوٹ پہ ہوں کافر پکّا

کب مسلکِ کُفر میں ہے کچّا کافر
دیتا نہیں ایمان کا غچّا کافر
میری تو نظر میں ہے بہت ہی بہتر
اِک جھوٹے مسلمان سے سچّا کافر

ہر چند اُسے مُنکرِ یزداں پایا
اِس پردۂ اِنکار میں انساں پایا
یعنی کہ مُنافق سے تقابل کرکے
کافر کو بھی اِک بندۂ ایماں پایا

گو اپنے ہو ملبوس میں گم ننگے ہو
خلعت میں دبائے ہوئے دُم ننگے ہو
گر دیکھ سکو خود کو تو مجھ میں دیکھو
آئینہ اگر میں ہوں تو تم ننگے ہو

مٹکائے ہوئے چتڑے ہیں انگے ہم لوگ
ملبوس میں ہیں رنگ برنگے ہم لوگ
محفل میں ہیں پوشاک جو پہنے تو کیا
پوشاک کے اندر تو ہیں ننگے ہم لوگ

بے جامے ہیں پہنے جو اُٹنگے وہ لوگ
محفل میں ہیں ڈاٹے ہوئے آنگے وہ لوگ
میں بزم میں ننگا ہوں، ہیں برہم مجھ سے
تنہائی میں رہتے ہیں جو ننگے وہ لوگ

خلوت میں تو اک نقشِ نجاست میں ہوں
اور بزم میں تصویرِ طہارت میں ہوں
تنہائی میں کرتا ہوں نہ جانے کیا کیا
محفل میں بڑا صاحبِ عزت میں ہوں

یہ خام نگاہی کا اُڑاتی ہے مذاق
ہاں ظلِّ الٰہی کا اُڑاتی ہے مذاق
یہ میری برہنگی بھی جانے کیا ہے
جو خلعتِ شاہی کا اُڑاتی ہے مذاق

اِک خار ہوں کلیوں میں، برہنہ میں ہوں
اک دانہ ہوں چھلیوں میں، برہنہ میں ہوں
نہ خانوں میں، کمبل میں ہیں جس کے شہری
اُس شہر کی گلیوں میں، برہنہ میں ہوں

تم دیکھو، میں نالے میں الف ہوں ننگا
سچائی کے ہالے میں الف ہوں ننگا
خلوت کے لحافوں میں ہو اور چپکے میں
پڑتے ہوئے پالے میں الف ہوں ننگا

تم خلوتِ گرم میں ہو پہنے آنگا
ہو سمٹے ہوئے، میں کہ ہوں بالکل چنگا
بستی کے کڑکتے ہوئے اس جاڑے میں
چوراہے پہ میں ناچ رہا ہوں ننگا

یارو! یہ جو ہو خولِ نفاست پہنے
صورت پہ ہو اک اور ہی صورت پہنے
میں سطحِ وجود پر ہوں بالکل ننگا
اور تہ میں وجود کی ہوں خلعت پہنے

کیا تم سے کہوں میں بندگانِ سالوس؛
کہہ دوں جو حقیقت ہے تو ہو گے مایوس
کمخواب کی پوشاک میں عریاں تم ہو
میں ننگا کہ ہوں ننگ میں اپنے ملبوس

میں بُو پہ ہوں، تم رنگ پہ نازاں یارو!
میں دُر پہ ہوں، تم سنگ پہ نازاں یارو!
تم اپنے لبادے پہ ہو، لیکن میں تو
ہوں اپنے فقط ننگ پہ نازاں یارو!

سچائی کو چمکارنے والا میں ہوں
اور جھوٹ کو للکارنے والا میں ہوں
پیچھے سے چھرا مارنے والوں میں یہاں
آگے سے چھرا مارنے والا میں ہوں

میں کھینچ کے شہکار ہوں ننگا یارو
لکھ کر خطِ گلزار ہوں ننگا یارو
تم کونوں بچالوں ہی میں ہوتے ہو فقط
اور میں سرِ بازار ہوں ننگا یارو

موقع کو وہیں تاڑ کے ننگا ناچا
جھنڈے کو وہیں گاڑ کے ننگا ناچا
پھر سب سے بڑے چوک پہ سب نے دیکھا
کپڑوں کو میں جب پھاڑ کے ننگا ناچا

سوتے میں جگا رہی ہے تم کو دیکھو
کیا تم ہو بتا رہی ہے تم کو دیکھو
چوراہے پہ، یہ میری برہنہ حالت
آئینہ دکھا رہی ہے تم کو دیکھو

محفل میں جو شائستہ ہو، پہنے آنگا
اور کونوں بچالوں میں ہو کرتے دنگا
خلوت میں ہو تم لوگ برہنہ، لیکن
چوراہے پہ اک میں ہی ہوں تنہا ننگا

اِس شان سے میں جو مرتکب ہوں ننگا
ہاں ڈھیٹ ہوں اے اہلِ شرف! ہوں ننگا
اے بزمِ لبادہ پوش! تجھ میں اک میں
بالکل ہی برہنہ ہوں، الف ہوں ننگا

کل دیکھا نہ جانے کہ تپنگا دیکھا
اپنے کو شریف — یا لفنگا دیکھا
یہ کون ہے اجنبی؟ یہ سوچا میں نے
کل خود کو جو آئینے میں ننگا دیکھا

جب بس نہ چلا ہار کے ننگا ناچا
ذہنوں کو میں للکار کے ننگا ناچا
رسوائی کے سامان تھے لیکن پھر بھی
میں بیچ میں بازار کے ننگا ناچا

چھلکے میں شرافت کے لفنگا تو ہے
اِک پھول کے پردے میں تپنگا تو ہے
دیوار پہ پرچھائیں نے میری مجھ کو
کل رات بتایا تھا کہ ننگا تو ہے

سب پہلو دکھا رہا ہوں اِک اِک کر کے
سب راز بتا رہا ہوں اِک اِک کر کے
جو میرے وجود پر ہیں پردے لاکھوں
میں اُن کو اُٹھا رہا ہوں اِک اِک کر کے

ہر ناپ سے ہر تول سے باہر نکلا
میں جس میں تھا اُس غول سے باہر نکلا
جو خول تھے پہنے ہوئے بچھڑے مجھ پر
جب توڑ کے میں خول سے باہر نکلا

گلدستے کی ہیں آڑ میں خنجر وہ لوگ
پردے میں نسیم کے ہیں صرصر وہ لوگ
ناراض ہیں۔ آپے سے جو باہر ہیں ہوں
آپے سے نہیں اپنے جو باہر وہ لوگ

خلوت کا جو بے نقاب دھندا کر دے
اخلاق کے بھاؤ کو جو مندا کر دے
ہے ساری ہی مچھلیوں سے پیاری مجھ کو
وہ مچھلی جو تالاب کو گندا کر دے

۵۷

دن رات ٹٹولتا ہوں کچا چٹھا
میزان میں تولتا ہوں کچا چٹھا
تم اوروں کی کھولتے ہو لو لیں اور میں
خود اپنا ہی کھولتا ہوں کچا چٹھا

دل میں ترے چھالا ہوں عجب بندہ ہوں
بالکل ہی نرالا ہوں، عجب بندہ ہوں
میں جھوٹ نہیں بولتا غم تو یہ ہے
سچ بولنے والا ہوں عجب بندہ ہوں

سچ بات سناتا ہوں عجب ہوں میں بھی
پردوں کو اٹھاتا ہوں عجب ہوں میں بھی
جو خود کی ہو تم بات چھپاتے ۔ اپنی
میں وہ ہی دکھاتا ہوں عجب ہوں میں بھی

میں قول میں صادق ہوں یہ کیا میں ہوں؟
سچائی کا خالق ہوں، یہ کیا میں ہوں؟
میں اپنا ہی معشوق ہوں بالکل سچ ہے
اور اپنا ہی عاشق ہوں، یہ کیا میں ہوں؟

کر کے اُسے خود تلاش، دیکھی ہوتی
کس طرح پڑی تھی۔ کاش، دیکھی ہوتی
منظر وہ عجیب ہوتا، میں نے مر کر
خود اپنی اگر جو لاش دیکھی ہوتی

ہر روز ہی کرتا ہوں ستم اور غضب
ہو جاتا ہوں اک پیکرِ عصیاں ہر شب
جو کچھ خلوت میں کر رہا ہوں۔ یارو!
میں جھانک کے خود دیکھ رہا ہوں وہ سب

میں آپ ہی اپنی شکل کیسے دیکھوں
خود، خود کو نظر آؤں میں جیسے دیکھوں
میں اپنے ہی آپ کو بتاؤ کیونکر
جیسے کہ کوئی اور ہے ایسے دیکھوں

اِک زاویۂ راز سے دیکھا میں نے
شرمندہ تھا، کب ناز سے دیکھا میں نے
جیسے کہ کوئی اور ہے، کوشش کر کے
کل خود کو اس انداز سے دیکھا میں نے

تھا بند جو میں نے در کو مڑ کے دیکھا
اپنے سوا کس بشر کو مڑ کے دیکھا
تنہائی میں اک گناہ کرتے ہوئے کل
کیوں میں نے ادھر ادھر کو مڑ کے دیکھا

جب جسم میں طوفانِ بلا آتا ہے
دل عیش کی وادی میں چلا آتا ہے
کیوں ہوں میں گنہگار یہ سب ہے ظاہر
کرنے میں گناہوں کے مزا آتا ہے

آئینے میں دیکھنے کی عادت اپنی
اب حد سے گزر چکی محبت اپنی
پانی جو نظر آئے تو فوراً جھک کر
میں اس میں بھی دیکھتا ہوں صورت اپنی

ہاں شام و سحر سامنے آئینہ ہو
اک ڈالوں نظر سامنے آئینہ ہو
سولی پہ میں لگ رہا ہوں کیا دیکھوں
سولی کے اگر سامنے آئینہ ہو

کیوں اُتری ہیولیٰ؟ کون ہے؟ میں نے پوچھا
مُوسیٰ ہے کہ فرعون ہے؟ میں نے پوچھا
آئینے میں کل عکس جو دیکھا اپنا
آئینے میں یہ کون ہے؟ میں نے پوچھا

میں کیا ہوں؟ یہ آئینے میں دیکھوں، بالکل
پھر عکس نے میرے کہا: "کہہ دوں؟" - بالکل
تو اور ہی کچھ ہے اُس سے جو کچھ تو ہے
اور میں ہوں کہ جو کچھ ہوں وہی ہوں بالکل"

لاوا ہوں اُبل پڑوں تو دیکھو کیا ہوں
ڈبے سے اُچھل پڑوں تو دیکھو کیا ہوں
میں خود میں زبردست ہوں اپنا پردہ
میں خود سے نکل پڑوں تو دیکھو کیا ہوں

اک تارِ خطرناک پہ چل کر میں نے
جلوہ جو کیا اپنا سنبھل کر میں نے
میں ڈر گیا جس وقت کہ خود کو دیکھا
کل اپنے وجود سے نکل کر میں نے

"دل تیرا مُسلسل ہے کہ تخمینے میں"
"ہندسوں کی مشینیں ہیں ترے سینے میں"
یہ بات مرا عکس کہا کرتا ہے
مجھ سے ہی مرے قیمتی آئینے میں

"سازش کے ترے دل میں ہیں ڈیرے کیا کیا
واقف ہوں کہ کرتوت ہیں تیرے کیا کیا"
ہاں مجھ سے لگاتار کہا تھا۔ تا دیر
آئینے میں کل عکس نے میرے کیا کیا

آئینے میں کل میں جو تھا ناظر اے عکس!
تو کتنا حسین کتنا تھا کافر اے عکس!
اُف کتنا میں چاہتا ہوں تجھ کو اور تو
اِس حد کا ہے مجھ سے متنفر اے عکس!

حمام میں کل شام میں آیا جیسے
پھر میں نے لبادے کو اُتارا جیسے
آئینے میں یوں عکس نے گھُورا مجھ کو
قابیل نے ہابیل کو دیکھا جیسے

جو کالے سنپولیے تھے بھورے نکلے
انڈوں سے وہ ناگن کے ادھورے نکلے
جب اپنے وجود کی درازیں کھینچیں
اُن میں سے ہوس کے کن کھجورے نکلے

اُس در میں جو جھانکا تو سبھی کچھ تھا اُجاڑ
گُل ہو گئے میں سمجھا تھا پر نکلے جھنکاڑ
کچھ بھوت نکل پڑے تھے بالکل ننگے
کل اپنے وجود کے جو کھولے کیواڑ

خوں خوار چڑیل تھی جو منڈی دیکھی
پنجے سے وہ کھولتی تھی گھنڈی دیکھی
جو میرے وجود کی ہے تہ میں اک سمت
وہ کوٹھڑی جب کھول کے کنڈی دیکھی

اندر سے نکل پڑے تھے کتنے جنّات
اک غول چڑیلوں کا، بلاؤں کی برات
جو میرے وجود پر پڑا تھا "تالا"
وہ میں نے اندھیرے میں جو توڑا کل رات

یہ سایہ ڈراؤنا اُبھرتا کیوں ہے؟
خونخوار ہے؟ رہ رہ کے بپھرتا کیوں ہے؟
"تو کون ہے؟" پوچھا تو یہ آئی آواز:
مجھ سے، میں تری رُوح ہوں ڈرتا کیوں ہے؟

بھوتوں کی یہ چھاؤنی ہے۔ توبہ توبہ
کیسی بھدی گھناؤنی ہے۔ توبہ توبہ
جو پردۂ ذات میں ہے میرے وہ رُوح
اُف کتنی ڈراؤنی ہے۔ توبہ توبہ

میں نے اُسے ڈگڈگی بجا کر دیکھا
اُنگلی کے اِشاروں پہ نچا کر دیکھا
اُف کتنی ڈراؤنی تھی۔ میں نے اپنی
کل رُوح کو۔ پردہ جو اُٹھا کر دیکھا

تھی دُور تو للکار رہی تھی مجھ کو
ناگن سی تھی پھنکار رہی تھی مجھ کو
"تو تو ہے مرا جسم" یہ کہہ کر اِک رُوح
پاس آئی تو چمکار رہی تھی مجھ کو

کل مجھ سے یہ دیوِ حرص بولا آؤں
آسیبِ ہوس کی داشتہ سے ملواؤں؟
ہوتے ہی تعارف وہیں دیکھا میں نے
جنگل میں مری روح تھی ننگے پاؤں

اک حلقہ کیے ناچ رہے تھے جنّات
تھا بیچ میں میں خود سے ہی کرتا ہوا بات
مَعمورۂ گمنام کے چوراہے پر
خود اپنے ہی آپ سے ملا تھا کل رات

جب دیکھی، میں جس میں تھا، عماری میں نے
اُس میں سے جو ذات اپنی اُتاری میں نے
ہلکی سی جھلک دیکھ کے اپنی۔ خود ہی
ویرانے میں اک چیخ تھی ماری میں نے

گر ریشمیں پردے کے اُدھر جائیں گے
خوں خوار بلا دیکھ کے مَر جائیں گے
جو مجھ میں قیامت کی کشش پاتے ہیں
دیکھیں جو مری روح تو ڈر جائیں گے

گونجی یہ صدا کھنڈر میں "ایسی میں ہوں
کون ایسی خطرناک کہ جیسی میں ہوں"
خوں خوار چڑیل تھی جو بڑھ کر بولی:
"ہاں دیکھ تری روح ہوں کیسی میں ہوں"

چاروں طرف اک چھلانگ بھرتی عریاں
غائب ہو ہو کے پھر ابھرتی عریاں
کل رات خود اپنی روح دیکھی میں نے
صحرائے ہوس میں رقص کرتی عریاں

سمجھا تھا تصور میں تو بانکا میں نے
جب دیکھا تو ڈرتے ہوئے ہانکا میں نے
اک روح نظر آئی بڑی ہی گندی
کل اپنے وجود میں جو جھانکا میں نے

ساجد کا نہ مسجود کا عالم دیکھا
حامد کا نہ محمود کا عالم دیکھا
کل پردۂ دل، دل سے اٹھا کر، دل میں
بھوتوں کی اچھل کود کا عالم دیکھا

میں کیا ہوں اِنجیل سمجھنے والا
توریت کی تفصیل سمجھنے والا
آئینے میں عکس کو سمجھ کر قابیل
میں خود کو ہوں ہابیل سمجھنے والا

ہو میرے جہاں بس میں وہیں ہوں ایسا
جیسا نظر آتا ہوں، کہیں ہوں ایسا!
دایاں مرا بایاں ہے تو بایاں دایاں
آئینے میں جیسا ہوں نہیں ہوں ایسا

آئینے میں خود کو دیکھا بانکا میں نے
پردوں کا مگر توڑ کے ٹانکا میں نے
کتنے ہی گھناؤنے ارادے دیکھے
جب اپنے دماغ و دل میں جھانکا میں نے

اغراض کا لگتا ہوا تخمینہ ہوں
جو بد ہیں اُن اعمال کا گنجینہ ہوں
یہ بزم ہے حمّام تو اس میں یارو!
میں کچھ نہیں دیوار پہ آئینہ ہوں

ایجاد سے تیری ہے یہ بڑھ کر ایجاد
اس میں ہوا اک اور ہی جوہر ایجاد
ہوں جس میں نہ دائیں بائیں اُلٹے سیدھے
وہ آئینہ کرتا ہوں سکندر! ایجاد

شہکار میں ہر رنگ نکھر آتا ہے
جو نقشِ حقیقت سے اُبھر آتا ہے
یہ آئینہ ایسا ہے کہ دایاں جس میں
بایاں نہیں، دایاں ہی نظر آتا ہے

ہم دونوں کے بالکل تھے نمایاں کل ہاتھ
آئینے میں سوئے عکس، بایاں کل ہاتھ
میں نے جو بڑھایا تو جوابًا اُس نے
فوراً ہی بڑھا دیا تھا دایاں کل ہاتھ

آئینے میں کس طرح سنورتا میں ہوں
اک عکس تمہارا ہوں اُبھرتا میں ہوں
ہے فرقِ چپ و راست، وگرنہ بالکل
جو کچھ کرتے ہو تم وہ کرتا میں ہوں

ہوس

آئینۂ حمام

ایمان ہوں کہ دین ہوں، نہ سوچا ہیں نے
ہیرا ہوں، نگیں ہوں کہ، نہ سوچا ہیں نے
یہ آئینہ کیسا ہے کہ جس میں خود کو
یوسف سے حسیں ہوں، نہ سوچا ہیں نے

اس شہر پہ ہاں آگ کی بارش کرنے
ہر چیز یہاں کی نذرِ آتش کرنے
اک پردۂ دوستی میں، تم کیا جانو
آیا ہوں خطرناک میں سازش کرنے

کب نگری کی قسمت کا نوشتہ سمجھے
سب لوگ مرا اُن سے ہے رشتہ سمجھے
سب کام ہیں اب ٹھیک کہ مجھ کو سب لوگ
جاسوس ہوں، رحمت کا فرشتہ سمجھے

ترکیب سے مانوس ہوں، واقف کب ہیں
اِن کے لیئے منحوس ہوں، واقف کب ہیں
بستی کے مجھے راز بتانے والے
اِس راز سے، جاسوس ہوں، واقف کب ہیں

جاسوسی دکھانے کے لیئے آیا ہوں
بستی کو جلانے کے لیئے آیا ہوں
کہتا ہوں کہ ہوں آگ بجھانے والا
گو آگ لگانے کے لیئے آیا ہوں

کام اِس سے نِکل جائے تو کیا سمجھوں گا
پہیے کو میں ڈھرّے سے ہٹا سمجھوں گا
لیکن مری وابستہ غرض ہے جب تک
اِس شخص کو میں اپنا خدا سمجھوں گا

قدموں میں ہوں، جب جام نکل جائے گا
فہرست سے ہاں یہ نام نکل جائے گا
پرسوں اِسے پہچانوں تو میں ہوں کافر
کل اِس سے مرا کام نکل جائے گا

ساغر یہ میں پی رہا ہوں ساغر اسے دو!
کوئی بھی نہیں تیری برابر اسے دو!
زینے پہ سماج کے وہ سیڑھی تو ہے
اونچا ہوں، کھڑا ہو کے میں جس پر اسے دو!

ہاں یوں تو دیئے جام لبا لب بھر کے
لوگوں کو دیئے چرکوں پہ نئے چرکے
زینے پہ سماج کے ہوا ہوں اونچا
ہر سیڑھی پہ مت پوچھ کہ کیا کیا کر کے؟

شیطان سے بلالی ہیں جو بیتالیں میں نے
لوگوں کی اُتار لی ہیں کھالیں میں نے
شاطر ہوں قیامت کا، چلی ہیں کیا کیا
اِس پردۂ تہذیب میں چالیں میں نے

غم ہیں دلِ عشاق میں کیسے کیسے
اعمال ہیں اِس طاق میں کیسے کیسے
کرتوت دھڑلے سے کیے ہیں میں نے
اِس پردۂ اخلاق میں کیسے کیسے

اِس خلوتِ سنجاب میں جو کچھ میں ہوں
ہاں مخمل و کم خواب میں جو کچھ میں ہوں
خود سے بھی چھپا رہا ہوں، تم تو کیا ہو
اِس پردۂ آداب میں جو کچھ میں ہوں

جو کچھ ہے چھپا رہا ہوں چکر، مت پوچھ
چکر پہ لگا رہا ہوں چکر، مت پوچھ
اِک پردۂ آداب ہے بیک، جس میں
کیا کیا میں چلا رہا ہوں چکر، مت پوچھ

دَرما ہا میں زوجہ کو جو دے کر پہنچا
میں کشتی کو منجدھار پہ کھے کر پہنچا
سب اُس کو جو دیکھیں تو مجھے بھی دیکھیں
محفل میں کسی شوخ کو لے کر پہنچا

سب کو میں وہاں چہرہ دکھانے پہنچا
ہوں تاجرِ خوش ذوق، بتانے پہنچا
میں فن کی نمائش میں، تمھیں کیا معلوم؟
لوگوں سے رہ و رسم بڑھانے پہنچا

لالچ کا لگائے ہوئے روگ آتے ہیں
نقصان کا کرتے ہوئے سوگ آتے ہیں
اِک ایسے کلب کا بن گیا ہوں ممبر
جس میں کہ بڑے کام کے لوگ آتے ہیں

میں تاش کا ماہر ہوں، عجب فن یہ ہے
میں سیکھ گیا ناچ۔ اب اُلجھن یہ ہے
پانی سے اگرچہ میں ہوں ڈرتا، پھر بھی
اب تیرنا سیکھوں گا کہ فیشن یہ ہے

آئے کوئی صوفے پہ بٹھا دیتا ہوں
"جاتا ہوں نہانے کو" بتا دیتا ہوں
حمام میں پھر شور مچا کر، اُس کو
عاشق ہوں بِچھوِن کا دکھا دیتا ہوں

محفل پہ عجب رنگ جمایا، کل شام
"یہ چیز تو نادر ہے" بتایا، کل شام
میں نے کسی ٹھینکرے کو ثابت کر کے
زہرہ کی رکابی کا دکھایا، کل شام

تصویریں جو لے کے میں زد کرتا ہوں
اِس بات میں ترکیب کی حد کرتا ہوں
میں فن کو سمجھتا ہوں، یہ سب سمجھیں گے
بے چارے مُصَوِّر کی مَدَد کرتا ہوں

مانگی تو خوشامد سے تھی میں نے وہ لکیر
لیکن بہو کی شاہ نشین میں تقریر
نقاش کی در اصل مدد کرنے کو
بے چارہ پریشان تھا، خریدی تصویر

زیبا نہیں خود کروں جو اپنی توصیف
آئے کوئی، کہتا ہوں کہ "رکھیئے تشریف"
گندھارا کا کارِ فن پہ گوتم لیکن
کرتا ہے مرے ذوقِ ہنر کی تعریف

اِک زاویۂ راز سے دیکھی میں نے
اِک فاصلۂ ناز سے دیکھی میں نے
نقّاش بھی سمجھا کہ سمجھتا میں ہوں
تصویر اِس انداز سے دیکھی میں نے

فن کار کو دو جام دیئے ہیں، میں نے
ترکیب سے مانا کہ لیئے ہیں، میں نے
سب دیکھنے آتے ہیں مکاں پر میرے
شہکار، اکٹھے جو کیئے ہیں، میں نے

گندھارا کا گوشے میں جو گوتم، میں نے
رکھا ہے انہیں کرنے کو گم سُم، میں نے
ہر شخص سے کہتے ہوئے اصلی یہ ہے
دل میں کیا ہلکا سا تبسّم، میں نے

نقصان کے ڈھانچے پہ کھڑا، فائدہ ہے
کھودوں جو دفینے سے گڑا، فائدہ ہے
ہر کام کا آدمی ہے واقف، اِس سے
میں دوستی کر لوں تو بڑا فائدہ ہے

بن ٹھن کے ہر اک بزم میں جاتا یوں ہوں
یہ سچ ہے کہ میں پیتا پلاتا یوں ہوں
کچھ اِس میں مرا فائدہ ہو جاتا ہے
لوگوں سے رہ و رسم بڑھاتا یوں ہوں

"یاد آیا" یہی کہہ کے سُنانا ہے مجھے
خود ہنسنا نہیں، اُن کو ہنسانا ہے مجھے
بن ٹھن کے کتابوں میں لطیفے پڑھ کر
اِک محفلِ گل رنگ میں جانا ہے مجھے

کی بات جو کچھ عام روش سے ہٹ کر
ہر کوئی تھا پھر علم میں مجھ سے گھٹ کر
اِک بزم میں، کل گھر سے جو چلتے چلتے
پہنچا تھا میں دو چار مقولے رٹ کر

اُس بزم میں، کچھ مانگ کے پہنے پہنچوں
سب لوگ توجّہ دیں، میں جیسے پہنچوں
اُس میں تو بڑے کام کے لوگ آئیں گے
یہ فکر ہے مجھ کو کہ میں کیسے پہنچوں!

آئینے میں خود کو تک کے، میں بھی پہنچا
تھوڑی سی قسم اُچک کے، میں بھی پہنچا
تھی محفلِ تاجراں برائے حُکّام
کل اُس میں چمک دمک کے، میں بھی پہنچا

ہر کام، میں اپنے آپ کر کے پہنچا
ہر چیز کی خوب ناپ کر کے پہنچا
اِک محفلِ خاص تھی کہ جس میں کل شب
میں خوب ہی ٹیپ ٹاپ کر کے پہنچا

میں بزم میں لگ رہا تھا کیسا؟ میں نے
جب پلٹا تو آئینے میں دیکھا میں نے
تو عکس ہے: "کس کس کی اُتاری ساڑی
دل دل ہی میں تو نے؟" یہ سُنا تھا میں نے

اب جنسی کشش کا تو یقیں اور بھی ہے
وہ شوخ نمائش میں حسیں اور بھی ہے
تصویر دکھاتا ہے مصوّر۔ مجھ کو
اور میری توجّہ کہ کہیں اور بھی ہے

آیا ہوں نمائش میں، یہیں دیکھوں گا
جتنے یہاں آئے ہیں حسیں دیکھوں گا
تصویریں جہاں گھوم رہی ہوں زندہ
کاغذ کی میں تصویر نہیں دیکھوں گا

کل راہ جوگیری کی پکڑی میں نے
کب فن کی نمائش پہ نظر کی میں نے؟
ہر ایک حسینہ کو تو دیکھا۔ لیکن
واں ایک بھی تصویر نہ دیکھی میں نے

مجمع میں حسینوں کے مجھے بھی لے جاؤ
یہ فن کی نمائش ہے، یہاں تو آؤ
اِک جاننے والے سے کہا تھا میں نے
"وہ اتنی حسین کون ہے؟ اُس سے ملواؤ"

تھی عشق کی تحریک تو میں نے پوچھا
پوشاک تھی باریک تو میں نے پوچھا
نقاش سے "تصویر کی قیمت کیا ہے"؟
اِک شوخ تھی نزدیک تو میں نے پوچھا

تصویر وہ لایا جو بنا کر، مانگی
ہاں دوستی، کچھ اور بڑھا کر مانگی
سب کو یہ بتانے کو "خریدی میں نے"
تھوڑی سی مصوّر کو پلا کر مانگی

اُتری جو تھی آکاش سے، دی تھی تصویر
لیکر اُسی قلّاش سے، دی تھی تصویر
اِک کام کے آدمی کو، راضی کرنے
کل مانگ کے نقاش سے، دی تھی تصویر

اُس شوخ سے پوچھا جو بہت تھی طرّار
"ہے کون پسندیدہ تمھارا فن کار؟"
اِک نام بتایا تو کہا یہ میں نے
"اُس کے تو مرے گھر پہ کئی ہیں شہکار"

رُخ دیکھ کے ہاں غور سے کہنا ہے مجھے
سچ جیسے ہو اِس طور سے کہنا ہے مجھے
"تم سے نہیں بڑھ کر کوئی دُنیا میں حسین"
کل کو بھی کسی اور سے کہنا ہے مجھے

سارے ہی نگاروں سے کہی ہے، میں نے
ہاں جملہ ستاروں سے کہی ہے، میں نے
"تم سے نہیں بڑھ کر کوئی دُنیا میں عزیز"
یہ بات، ہزاروں سے کہی ہے میں نے

پہناتے ہوئے ہار، یہ میں نے سوچا
ہر بات پہ ہر بار، یہ میں نے سوچا
جب میری محبت کا وہ کرتی تھی یقین
اچھا ہوں اداکار، یہ میں نے سوچا

نزدیک کے میخانے میں پی کر دو جام
اِک دوست سے ملنے میں گیا تھا کل شام
وہ تو نہ تھا موجود لیکن اُس کی
خواہر نظر آئی تو مرا ہو گیا کام

جب اُس کے لیۓ لے کے گیا گلدستہ
اور "شکریہ" اُس نے جو کہا برجستہ
منزل پہ پہنچ جاؤں گا، شک ہی کیا ہے
منزل کا مجھے مِل تو گیا ہے رستہ

اُس شوخ نے کل زُلف پریشان کر دی
فوراً ہی مری بات پہ پھر "ہاں" کر دی
دنیاۓ معاشقہ میں جو تھی مشکل
اِک عطر کی شیشی نے وہ آسان کر دی

اِک مِل کا میں مالک ہوں، بتایا میں نے
موسیقی سمجھتا ہوں، دکھایا میں نے
چڑیا کا غلام ہوں اور ایسا کر کے
بے حکم کی رانی کو پھنسایا میں نے

ہر شب کو ہی سامانِ وفا باندھوں گا
زلفوں ہی میں ایمانِ وفا باندھوں گا
آج اِس سے تو کل اُس سے، اگر برسوں کو
اِک اور سے پیمانِ وفا باندھوں گا

"شیریں! ترا فرہاد" کہا تھا کس سے؟
"ہے عشق میں برباد" کہا تھا کس سے؟
"میں تم کو کبھی بھول نہیں سکتا ہوں"
اب یہ بھی نہیں یاد، کہا تھا کس سے؟

کل جن کے قدم میں تھا رکھا دل میں نے
مانا، جنہیں آب و گِل کا حاصِل میں نے
خود اُن کے ہی کہنے سے اُنہیں پہچانا
وہ آج ملے جب تو بہ مشکل میں نے

کہتا میں محبت سے تھا جس سے: "کافر!
تجھ سے جو بچھڑ جاؤں تو مر جاؤں گا پھر"
میں جس کیلئے جان دیئے دیتا تھا
وہ کون تھی؟ کیا نام تھا اُس کا آخر؟

سرما کے مہینوں کا ہوا کیا آخر
اُن سارے حسینوں کا ہوا کیا آخر
جن سے کہ کیئے میں نے تھے جھوٹے وعدے
اُن زہرہ جبینوں کا ہوا کیا آخر؟

وہ اُن دِنوں ارمان، نہ جانے کیا تھے؟
مُحکَم تھے کہ بے جان، نہ جانے کیا تھے؟
سینے سے لگا کر جو کیئے تھے اِک سے
وہ عہد، وہ پیمان، نہ جانے کیا تھے؟

آتا مجھے اِک اور حسیں ہے اب یاد
پہلے جو تھی محبوب کہیں ہے اب یاد!
مجھ کو، یہ حقیقت ہے کہ اُس سے میرے
وعدے تو ہیں کیا، وہ بھی نہیں ہے اب یاد

ہیں نقش بروئے آب، ورنہ کیا ہیں؟
خوش وقتی کا ایک باب، ورنہ کیا ہیں؟
صحرائے مراعاشقہ ہیں، میرے پیمان
کچھ ہیں تو فقط سراب، ورنہ کیا ہیں؟

کوچے میں ہر اِک در پہ نظر ہے میری
اِک دوست کی خواہر پہ نظر ہے میری
سب مجھ کو محلے میں سمجھتے ہیں شریف
ہمسائے کی دُختر پہ نظر ہے میری

۸۵

چمکائے ہوئے گال پھر آ پہنچی ہے
مہکائے ہوئے بال پھر آ پہنچی ہے
جس کو بڑی مشکل سے تھا ٹالا کل شام
وہ جان کا جنجال پھر آ پہنچی ہے

گلدستہ مرے واسطے لائی کیوں ہے؟
بیٹھی ہوئی جم کے مسکرائی کیوں ہے؟
محبوبۂ موجودہ کی رہ دیکھتے ہیں
معشوقۂ سابق یہاں آئی کیوں ہے؟

اب اُس کی بڑی عجیب حالت کیوں ہے؟
اب مجھ سے محبت میں یہ شدت کیوں ہے؟
کل جس سے کہا تھا "مری راحت ہے تُو"
وہ آج مرے سر پہ مصیبت کیوں ہے؟

ناراض نہ ہو جائے کچھ ایسے ٹالوں
اور ٹالنا لازمی ہے، بے جیسے ٹالوں
کل جس سے کہا تھا کہ تو لاثانی ہے
آج آئی تو ہے فکر کہ کیسے ٹالوں؟

جذباتِ وفا کی آڑ کر کے، میں نے
رائی تھی، جسے پہاڑ کر کے، میں نے
کیوں سر پہ یہ بے کار مصیبت لے لی!
اِک شوخ سے چھیڑ چھاڑ کر کے میں نے

جو تھوک کہ خود تھوکا ہے چاٹوں کیسے!
جو غار کہ خود کھودا ہے پاٹوں کیسے!
کل جس کو یونہی "جانِ تمنا" تھا کہا
اب جان کا آزار ہے، کاٹوں کیسے!

کب اہلِ جہاں کی بات جھیلی میں نے
ناؤ جو غرض کی تھی وہ کھے لی میں نے
جب اپنے ہی محبوب سے، یہ تو کیا ہیں
جو چال خطرناک تھی کھیلی میں نے

جس شوخ کے گھر تھا کبھی آنا جانا
آپس میں نِگاہوں کا تھا تانا بانا
جس کیلئے خودکشی کی کوشش کل کی
آج اُس کو جو دیکھا تو نہیں پہچانا

اِس بستی میں اِک اور نشہ ہے طاری
اِک اور کو کہہ رہا ہوں "میری پیاری"
اور بھاگ کے جس شہر سے آیا ہوں وہاں
محبوبۂ سابق کے ہیں پاؤں بھاری

تھی کھوئی ہوئی مسلکِ فرسودہ میں
کہ اُس کی جگہ اب دلِ آسودہ میں
معشوقۂ سابق میں نہیں تھی وہ بات
جو بات ہے محبوبۂ موجودہ میں

جب بھید ملا اِس دلِ آسودہ کا
جب علم ہوا نامۂ آلودہ کا
"تم مجھ کو بھی بھولو گے" بجائے مجھ سے
شکوہ جو ہے محبوبۂ موجودہ کا

وہ ذکر کہ لاتی ہی نہیں ہے میرا
افسانہ، سُناتی ہی نہیں ہے میرا
گو ہر کس و ناکس کے ہیں طعنے ہر دم
اور نام بتاتی ہی نہیں ہے میرا

اب دل میں نہیں جس کا نشاں، سُنتا ہوں
کچھ روز میں بننے کو ہے ماں، سُنتا ہوں
دس ماہ ہوئے، جس سے مِلا تھا، دو ماہ
اب اُس کو مہینہ ہے نواں، سُنتا ہوں

اب دل سے مرے نکلی ہوئی ہے وہ شوخ
اب سرکا مرے دَرد بنی ہے وہ شوخ
خود اپنے وجُود میں چھپا کر سب سے
لغزش کو مری پال رہی ہے وہ شوخ

پہلے وہ مُلاقات کی کوشش میری
پھر اُس کے وہ ٹالنے میں کاوِش میری
آج، اُس کے وجُود میں، جو بعدِ مُدّت
دیکھا۔ تو نمُودار تھی لغزش میری

نو ماہ کی ہے بات کہ سَر کو دُھن کر
جِس شوخ کو تحفے دیئے میں نے چُن کر
اُف کتنا میں ناچا ہوں خوشی کے مارے
آج اُس کی ہی خودکشی کی خبر یہ سُن کر

معلوم ہے کیوں بال تھے میرے جیسے
واقف ہوں کہ کیوں گال تھے میرے جیسے
نالے پہ وہ ننھّی سی جو جاں تھی، اُس کے
بالکل ہی خدوخال تھے میرے جیسے

یاد آئی، وہ جو بات تھی سر سے نکلی
کھولا جو اُسے کاغذِ تر سے نکلی
وہ میرے ضمیر کی تھی شک ہی کیا ہے!
ننھّی سی جو اک لاش گٹر سے نکلی

پیمان تھے جھوٹے جو کیے تھے رہ میں
لایا تھا کسی شوخ کو اپنی شہ میں
اب میرے گناہ کی وہ زندہ صورت
لپٹی ہوئی بہتی ہے گٹر کی تہ میں

دُنیا کو بجاتے ہوئے تاشہ دیکھو
کانٹے ہیں مرے ہے جو وہ ماشہ دیکھو
نالے پہ پڑا، لپٹا ہوا چیتھڑوں میں
وہ میرے ضمیر کا ہے لاشہ دیکھو

میں داشتہ کے پاس اُٹھا کر اِک جام
کس ٹھاٹ سے بیٹھا رہا اور ہو گئی شام
گھر آ کے یہ زوجہ سے کہا "تھک گیا ہوں"
"دفتر میں حسابات کا کرتے ہوئے کام"

تبدیلیٔ موسم کے سبب اے مرے یار!
جیسے ہی ہوئی داشتہ میری بیمار
جو سستی دوائیں تھیں وہ جا کر بازار
خود لایا کہ یہ شب بھی نہ جائے بیکار

دو کوڑی کا ایمان تھا، ایمان دیا
اور خیمۂ مستی کو وہیں تان دیا
مس کر ہی لیں میں نے وہ ملائم پوریں
اِک دوست کی زوجہ نے جو کل پان دیا

میں ریشمیں پردوں میں سنورنے والا
ساغر ہے انگور سے بھرنے والا
میں اور محبت سرِ مقتل؛ توبہ
ہوں شاہ نشیں میں عشق کرنے والا

جہدِ حیات

پُرخار ہے جس دشت میں میں رہتا ہوں

ہر جھاڑی سے وابستہ ہیں اب اتنا ہوں

[illegible] تو اندھیرے میں ٹٹولا کرو

[illegible] کہ میں ناگ [illegible] ہوں

ہستی کو ہیں چمکارنے والے ہم بھی
دل اپنا نہیں مارنے والے ہم بھی
طوفانِ حوادث جو ہے آتا، آئے
ہمت تو نہیں ہارنے والے ہم بھی

ہم ذائقۂ زیست کو چکھ سکتے ہیں
حالات کی نبضوں کو پرکھ سکتے ہیں
نازوں کے پلے ہیں، جو مصیبت آئے
کہسار کو ہم کاٹ کے رکھ سکتے ہیں

لادے ہوئے خود دار و رسن جاتے ہیں
باندھے ہوئے میداں میں کفن جاتے ہیں
ہم ہیں تو پرِ کاہ۔ ولیکن کہسار
آتا ہے جو طوفان تو بن جاتے ہیں

دل بحرِ وجود میں ڈبویا میں نے
جینے کی محبت ہی میں کھویا میں نے
کل پھول کا سایہ کہ تھا وزنی اور آج
شانے پہ پہاڑ کو ہے ڈھویا میں نے

مرغوب یہ زندگی کی مے ہے بالکل
سینے سے لگانیکی یہ شے ہے بالکل
ہاں ٹوٹ پڑے مجھ پہ قیامت پھر بھی
ہر حال میں جینا ہے یہ طے ہے بالکل

جو اصل میں منزل ہے وہ جادہ یہ ہے
ہاں مجھ کو عزیز حد سے زیادہ یہ ہے
یہ ایک ہی زندگی ہے، جیسے گزرے
میں اِس کو گزاروں گا ارادہ یہ ہے

کیا موقع ہے موقع کو وہیں تاڑوں گا
دامن پہ پڑے گرد، وہیں جھاڑوں گا
کتنی ہی بلا خیز بہاریں آئیں
میں اپنا گریبان تو نہیں پھاڑوں گا

کچھ دیر کو ہاں حشر اُٹھا بھی دیں گے
جو نقشِ تعلق ہے مِٹا بھی دیں گے
محبوبہ جو مر جائے تو دو اک دن میں
ہم یاد اُسے کر کے بھلا بھی دیں گے

ہاں جملہ فنونِ زندگانی سیکھے
گر، کیسے کریں خون کو پانی سیکھے
صحراؤں میں ہاں ناگ پھنی سے جا کر
ہم نے یہ اصولِ سخت جانی سیکھے

کچھ ہو مٹے ہستی تو مٹے جائیں گے
ماحول سے ہم جنگ کئے جائیں گے
جب جل سے سوا اس کے شدائد ہوں گے
تو ناگ پھنی بن کے جیئے جائیں گے

ہیرا جو نمو ہے تو کنی ہوں صحرا!
روئیدگی نیزہ تو انی ہوں صحرا!
ہاں شدّتِ موسم کہ مظالم کر لے
میں بھی تو مگر ناگ پھنی ہوں صحرا!

گمنام گگن میں جو رہا کرتا ہوں
ماحول کی میں نبض چھُوا کرتا ہوں
صحرا میں جو ہے ناگ پھنی کا کردار
اِس شہر میں اُس کو میں ادا کرتا ہوں

ماحول مخالف ہو سبھی ہو بے دین
موسم کے شدائد ہوں، زمیں ہو سنگین
پھلواری ہیں حالات یہ ہوں تو اپنا
پھر ناگ پھنی بن کے ہے جینا آئین

کس سے ہیں دبیں ناگ پھنی کی شاخیں
رکھتی ہیں یقیں ناگ پھنی کی شاخیں
ماحول کی سختی کہ تھی جتنی افزوں
اتنی ہی بڑھیں ناگ پھنی کی شاخیں

یوں ناگ پھنی کی تو نہ چھو لیں شاخیں
صحرا کی ہلا رہی ہیں چولیں شاخیں
ماحول مخالف کو ہے خطرہ لاحق
بادل کو کہیں بڑھ کے نہ چھو لیں شاخیں

کیا کوہ ہے ہاں کوہ کنی سے پوچھو
نیزہ کسے کہتے ہیں انی سے پوچھو
جینا کہ ہے اک جہدِ مسلسل، یہ راز
صحراؤں میں تم ناگ پھنی سے پوچھو

صحرا کی حرارت کو دکھاتا ہے مذاق
سُورج کی تمازت کا بناتا ہے مذاق
ہاں ناگ پھنی، پھیل کے اونچا ہو کر
موسم کے مظالم کا اُڑاتا ہے مذاق

یہ ناگ پھنی بولا کہ شرماتے ہیں
صحرا میں مجھے توڑنے جو آتے ہیں
قبل اس کے کہ میں ٹوٹوں یہ میرے کانٹے
دشمن کے وہیں ہاتھ میں چبھ جاتے ہیں

جاتا ہے کہاں، ناگ پھنی کو مت چھیڑ
ہاں بیٹھ یہاں، ناگ پھنی کو مت چھیڑ
اک ذاتی تحفظ کے لئے ہیں کانٹے
صحراؤں میں ہاں ناگ پھنی کو مت چھیڑ

سب کچھ کرتا ہوں میں برائے ہستی
ہر حال میں رہتا ہوں فدائے ہستی
واقف ہوں کسی وقت نکل جائے گی
ہاں جسم میں یہ جو ہے ہوائے ہستی

رگِ گل کی ہوں، اہلِ کاخ! بچ کر رہنا
چھیڑو گے تو ہوں سلاخ، بچ کر رہنا
گر توڑنا چاہتے ہو مجھ کو۔ پھر میں
ہوں ناگ پھنی کی شاخ. بچ کر رہنا

پھر کیا، جو ہیں اہلِ شہر مجھ سے حیراں
وہ شاہ نشیں ہیں جو رکھے تھے گلداں
اور اُن میں وہ کاغذ کے جُنے تھے جو پھول
صحراؤں کے تھے ناگ پھنی پر خنداں

ہر حال ہی میں سانس لیئے جاؤں گا
ہے زندگی اک جام پیئے جاؤں گا
گردن بھی جو کٹ جائے تو بے سر ہو کر
ممکن اگر ہوگا تو جیئے جاؤں گا

پوشیدہ ہی رہ کر نہ ہویدا ہو کر
میں رہ گیا زندگی پہ شیدا ہو کر
پیدا تو میں ہونا ہی نہیں چاہتا تھا
مرنا بھی نہیں چاہتا پیدا ہو کر

مقتل نامہ

معرفت

جب دل میں ہے معرفت کا پارہ چڑھتا
میں سجدے کو مقتل کی طرف یوں بڑھتا
قالین پہ، مرمر کی مساجد میں بھلا
جھاڑوں کے تلے نماز، اور میں پڑھتا

جاناں کے قدم چوم کے آپہنچے ہیں
ہم چاروں طرف گھوم کے آپہنچے ہیں
غائب ہے کدھر؟ ہم سرِ مقتل جلّاد
لہراتے ہوئے جھوم کے آپہنچے ہیں

معیار پہ دل اپنا پرکھ کر لائے
جو عشق کی لذّت ہے وہ چکھ کر لائے
مقتل میں وہ جلّاد نے بغلیں جھانکیں
ہم سر کو ہتھیلی پہ جو رکھ کر لائے

خود رکھ کے ہتھیلی پہ جو سر لایا ہوں
نُصرت کا پھریرا ہوں کہ لہرایا ہوں
محبوب کے تخلیئے میں جیسے پہنچا
اُس شان سے مقتل کی طرف آیا ہوں

ہم پر کرمِ حسن جو بے حد ہوگا
پُر نور اگر عالمِ آمد ہوگا
گردن زدنی اِس کی سزا ہے تو کیا
ہم سے یہ گناہِ عشق سرزد ہوگا

وعدہ جو کیا نورِ سحر سے میں نے
مقتل میں وہ ایفا کیا سر سے میں نے
جلاد کا کرنے کے لئے استقبال
چھڑکاؤ کیا خونِ جگر سے میں نے

مقتل میں بغاوت کا ترانہ میں نے
گایا۔ تو پھر اک نعرۂ لگایا میں نے
قاضی نے مری آخری خواہش پوچھی
تو خنجرِ جلاد کو چوما میں نے

مقتل میں وہ میری شان جا کر پوچھو
عاشق کی وہ آن بان جا کر پوچھو
جلاد سے اس کا تو یقین کر لو گے
تھا کتنا میں سخت جان جا کر پوچھو

جلاد! یہ ایذا ہے گوارا ہم کو
بھاتا ہے یہ مقتل کا نظارا ہم کو
تو سایۂ خنجر میں جسے پوچھتا ہے
وہ راز تو گردن سے ہے پیارا ہم کو

اِس شہرِ پُراسرار میں چُن کر مجھ کو
پھر ظلم کی دیوار میں چُن کر مجھ کو
حاکم نے وہ انصاف کی ٹانگی تصویر
دیوار پہ، آثار میں چُن کر مجھ کو

دیوار کے اِس رُخ پہ، محبّت تقصیر
ٹھیری۔ تو مجھے ٹانگا، پڑی ہے زنجیر
حاکم کی تو داشتہ کی بالکل عُریاں
دیوار کے اُس رُخ پہ ٹنگی ہے تصویر

اِس سمت فقط زخم، فقط آہیں ہیں
واں جام ہیں نغمات ہیں اور باہیں ہیں
دیوار کے اُس طرف مُنوّر رنگین
زنداں کے درو غہ کی طرب گاہیں ہیں

سر جو پسِ دیوار دیا تھا میں نے
تھی ظلم کی مِسمار کیا تھا میں نے
یہ سوچ کے دیوار میں رخنہ پڑ جائے
دیوار پہ سر مار لیا تھا میں نے

یہ پردوں کے پیچھے کوئی سازش کیوں ہے؟
اینٹوں میں اِس انداز کی جنبش کیوں ہے؟
آثار میں چُن دیا ہے کس کو؟ حاکم!
دیوارِ تشدّد میں یہ لرزش کیوں ہے؟

محفل میں یہیں رکھ دو یہ ساغر، دیکھو
عاشق پہ جو چل رہا ہے خنجر دیکھو
دیوار کو آگے سے تو دیکھا تم نے
دیوار کو پیچھے سے بھی جا کر دیکھو

درباری مصوّر سے جو مانگی تصویر
تو جملہ فصیلوں کو پھلانگی تصویر
حاکم نے وہ داشتہ کی بالکل ننگی
دیوارِ طرب گاہ پہ ٹانگی تصویر

مینائے مئے ناب، دمکتے رخسار
گلدان میں ہر پھول ہے چھڑتے ہیں ستار
دیوار کے اِس رُخ پہ ٹنگی ہیں لاشیں
دیوار کے اُس رُخ پہ لگے ہیں شہکار

میں نے کہ میں رہتا تھا مئے عشق پیے
پورے کیے، جو قول تھے جاناں کو دیے
مقتل میں جو سر اپنا بنایا تھا سپر
اک رازِ محبت کے تحفظ کے لیے

جلوہ نئے سانچے میں جو ڈھالا میں نے
اک پل کیلئے موت کو ٹالا میں نے
اپنے تنِ بے سر کو، تڑپتے ہوئے جب
سر ہاتھ میں لینے کو سنبھالا میں نے

قاتل کی نظر پھر جو تھی خنجر پر
تو خون کی کچھ بچی تھی نمی خنجر پر
سر کٹتے ہی، جب تن نے مرے رقص کیا
مقتل میں اُڑی دھول، جمی خنجر پر

یہ گرمِ بغاوت کا جو گاڑھا خون ہے
جو پہلوئے مقتل کا وہ گوناگوں ہے
سر کٹتے ہی میں تڑپا تو میرے تن سے
جلّاد یہ بولا کہ تڑپ کیوں ہے

مقتل میں تھا جلّاد، کلہاڑے پہ تھی سان
وار ہو کے بھی، جینے کا تھا مجھ کو ارمان
میرے تنِ بے سر نے وہیں پر بڑھ کر
ہاتھوں میں اُٹھا لیا تھا سر کو اک آن

میں پھر بھی بغاوت میں پنپ کر اُٹھا
اِک آگ تھی جس میں کہ میں تپ کر اُٹھا
سر کٹتے ہی۔ پھر جوشِ محبت آیا
مقتل میں مرا جسم تڑپ کر اُٹھا

میں غارِ جفا پاٹ رہا ہوں جلّاد
مٹّی میں تجھے آٹ رہا ہوں جلّاد
میں دھار سے گردن کی یہاں مقتل میں
خنجر کو ترے کاٹ رہا ہوں جلّاد

ہم تو ہیں کسی شوخ پہ مرنے والے
مقتل میں کسی سے کب ہیں ڈرنے والے
سر کٹنے سے پیشتر کسی بھی صورت
پیمانِ محبت نہیں کرنے والے

اُس نقش سے نمرود پہ خنجر کھینچا
آئینۂ سلطنت سے جوہر کھینچا
سر کٹتے ہی میں نے جو تڑپ کر اک نقش
انگشت سے مقتل کی زمیں پر کھینچا

گو ہاتھ میں لرزش تھی وہیں پر لکھا
تھا خوں جلی لوحِ یقیں پر لکھا
سر کٹتے ہی اک لفظِ "محبت" میں نے
انگشت سے مقتل کی زمیں پر لکھا

پھر کیا ہوا جس وقت کہ میرا سرِ شام
جلاد کے خنجر نے کیا کام تمام
انگشت سے مقتل کی زمیں پر لکھا
میرے تنِ بے سر نے تڑپ کر اک نام

لیکر وہیں مقتل کی زمیں پر توڑا
اِس پردے میں تاجِ زر و گوہر توڑا
میرے تنِ بے سر نے تڑپتے ہوئے جب
جلاد سے کل چھین کے خنجر توڑا

پھر اٹھا جو آستین اُلٹ کر خنجر
گردن سے مری رہ گیا کٹ کر خنجر
میرے تنِ بے سر نے، تڑپ کے اُٹھ کر
جلّاد سے چھینا جو جھپٹ کر خنجر

مقتل میں ہوا وار تو میں تھا بے سر
میرے تنِ بے سر نے وہیں پر بڑھ کر
جلّاد سے جھپٹا تو وہیں ہاتھوں سے
گھٹنے پہ دباتے ہوئے توڑا خنجر

آنکھیں تھیں اُسے گھورتی جب سر دیکھا
میں توڑتا ہوں اُس کا ہی خنجر دیکھا
سر کاٹ کے جلّاد نے میرے تن کو
مقتل میں بڑی دور سے جا کر دیکھا

"ہو" ہی ابھی مقتل میں کہا تھا یارو!
اِک وار میں پھر خون بہا تھا یارو!
سر میرا کٹا پڑا تھا۔ لیکن پھر بھی
"حق حق" لب سے نکل رہا تھا یارو!

جاناں سے محبت تو نہ میں نے بیچی
اِس پردے میں کشتِ رازِ یعنی سینچی
میں جتنی سمجھ رہا تھا کب دی ایذا
ظالم نے فقط کھال ہی میری کھینچی

خوش ہوں گا جو جلادِ لعین آئے گا
مر جاؤں تو حاکم کو یقین آئے گا
یعنی کہ یہ رازِ عشق، لب تک میرے
وہ کھال بھی کھینچے تو نہیں آئے گا

کیسی تری داشتہ نے بنوالی ہے
حاکم! تری خلوت میں وہ فن والی ہے
جو کھال مرے بدن سے تو نے کھینچی
فانوس کے تاروں پہ وہ تنوالی ہے

وہ بیٹھ کے کرتا تھا جدائی میری
تفصیل سے پھر خط بتائی میری
جس جا کہ تھی داشتہ کی خاطر منظور
حاکم نے وہاں کھال بچھائی میری

ہم جھوم کے لہرا کے چلے مقتل میں
عشاق کے کٹتے ہیں گلے مقتل میں
یہ حسن کا حق ہے جو ادا ہوتا ہے
جلّاد کے خنجر کے تلے مقتل میں

گردن تو اُڑا دے گی ہوائے خنجر
ہاں خون بہا دے گی ہوائے خنجر
لیکن جو چراغِ دل ہے روشن اُس کو
کس طرح بجھا دے گی ہوائے خنجر

میں جب تھا لہولہان۔ بولا جلّاد
'پھر تیغ پہ رکھوں سان؟' بولا جلّاد
سر کٹتے ہی، تا دیر میں تڑپا۔ مجھ سے
'تو کتنا ہے سخت جان" بولا جلّاد

جلّاد کہ جب تان رہا تھا خنجر
کہتا تھا "قبول کر اطاعت بڑھ کر"
تو مار کے نعرۂ بغاوت دو چار
مقتل کو اٹھا لیا تھا میں نے سر پر

کل کی تری دھمکی سے فگار آیا ہوں
اِس عشق میں سب کچھ ہی تو ہار آیا ہوں
گردن میں رسن ڈال کے اپنی، حاکم!
خود دوش پہ لادے ہوئے دار آیا ہوں

جَلا دو! جِلا دو تو نہیں کہنے کے
یا زندہ جلا دو تو نہیں کہنے کے
جو رازِ محبت ہے، اگر تم ہم کو
سُولی پہ چڑھا دو تو نہیں کہنے کے

مسجد کے میں غالیچے پہ کیسے پڑھتا
سر جب تھا کٹا پڑا تو لب تھا کھولا
مقتل کی زمیں میرے لہو سے قالین
جب بن گئی اُس پر پڑھا میں نے کلمہ

اپنی تو کہیں اور نظر ہی کب تھی
اِس عشق میں ہاں راہِ مفر ہی کب تھی
گردن پہ چلا رہا تھا خنجر جلّاد؛
مقتل میں ہوں، یہ مجھ کو خبر ہی کب تھی

ردکر کے نوشت و خواند، دیکھا میں نے
ہر چیز تھی اُس سے ماند، دیکھا میں نے
کل دار پہ لایا جو گیا تھا مجھ کو
حلقے سے رسن کے چاند دیکھا میں نے

حلقے سے رسن کے نظر آیا - چوما
رہ رہ کے اُفق پہ وہی مکھڑا، چوما
جب دار پہ آیا تھا تو میں نے پہلے
ریشم کا ٹنگا ہوا وہ پھندا چوما

کچھ بھی یہ شدائد کی گھڑی بات نہیں
زنجیر ہے کیا چیز؟ کڑی بات نہیں
اُس جانِ تمنّا کا تصوّر کر کے
ہم جان جو دیدیں تو بڑی بات نہیں

ظالم ہیں لگائے ہوئے کوڑے شاید
پھر راز کو پوچھتے ہیں گھڑے شاید
یاں جسم پہ بدھیاں سی اُبھریں میرے
واں دوست کے اگر رہے ہیں اُدھڑے شاید

اِس جھول میں کس طرح سے جھولیں دیکھو
کچھ بھی ہو یہ جاناں کو نہ بھولیں دیکھو
اب دار کی۔ دار پہ لٹک کر، یارو!
دم گھٹ کے ہلا رہا ہوں چولیں دیکھو

میں نیچے تھا تو ٹینک میں بولے اغیار
اب پیس کے اِس کو خاک کر دیں اک بار
میں پِس کے بھی بارود ہوا تھا اور پھر
شامل ہوا اک اُس میں مرے دل کا شرار

جو جسم میں ہڈیاں تھیں ڈھیلی کر دیں
گردن میں جو رسیاں تھیں ڈھیلی کر دیں
میں نے بھی کسی ٹینک کے نیچے پِس کر
اُس ٹینک کی ڈھبریاں تھیں ڈھیلی کر دیں

پی لی ہے بغاوت کی جو میں نے گھونٹی
ٹکراتا ہوں جس سے وہ ہے طاقت جھوٹی
میں ٹینک کے نیچے آ رہا ہوں تو کیا
اِس آہنی فیل کے لیئے ہوں چونٹی

یوں کب وہ نظرِ شکِ قمر آتا ہے
میں تم کو بتاتا ہوں کدھر آتا ہے
اُس شوخ کا جلوہ تو سرِ دار فقط
حلقے سے رسن ہی کے نظر آتا ہے

مژدہ ہے یہ مقتل سے بُلاوا آیا ہے
آخر غمِ جاناں کا مداوا آیا ہے
اُس جانِ تمنّا پہ نچھاور کرنے
اِک جان ہے جان کے علاوہ کیا ہے

کھیتوں میں خرامِ نازِ ہل کا دیکھو
ویرانی کا چھٹ گیا دھندلکا دیکھو
جلاد سے خنجر کو جھپٹ کر ہل کا
خنجر کو بنا رہا ہوں پھل کا دیکھو

گو امن کے ہوں گیت میں گانے والا
گر وقت پڑے، سر ہوں کٹانے والا
میں چھین کے دشمن سے اُسی کا ٹینک
ہوں اِس کا ٹریکٹر بنانے والا

مُشاہدا

محفل میں لیے ساز نہ ہو آنے والا
بیں نگہ بہ حد ناز نہ ہو آنے والا
مجذوب کہو یا کہ قلندر مجھ کو
حق گوئی سے کب باز نہ ہو آنے والا

اپنے کو میں خود سلام کر لوں اِک بار
میں خود سے مزاج اپنا پوچھوں اِک بار
میں چاہتا یہ ہوں کہ کسی صورت سے
خود میں سے نکل کے خود کو دیکھوں اِک بار

ہستی کی قیود سے نکل کر بھاگوں
عالم کی حدود سے نکل کر بھاگوں
اِس فکر میں رہتا ہوں کہ آخر کیونکر؟
میں اپنے وجود سے نکل کر بھاگوں

میں دل کے تقاضوں کو مروڑوں کیسے؟
جو کچھ مری فطرت ہے وہ چھوڑوں کیسے؟
زنجیرِ جبلت میں ہوں جکڑا ہوا میں
زنجیرِ جبلت کو میں توڑوں کیسے؟

خوں میرا بہا دے تو تعجب کیا ہے
اِک حشر اٹھا دے تو تعجب کیا ہے
ہاں مجھ سے یہ میرا عشق اِک دن مجھ کو
سُولی پہ چڑھا دے تو تعجب کیا ہے

جو حرف کہ لکھا وہ دکھایا تم کو
جو خط کہ بنایا وہ دکھایا تم کو
میرا جو ہے گرد و پیش، اُس کا عالم
جو میں نے ہے دیکھا وہ دکھایا تم کو

کب دے کے کبھی لیا ہے واپس میں نے
گر خود لیا تو کیا ہے واپس میں نے
جو کچھ مجھے دُنیا نے دیا تھا وہ سب
دُنیا ہی کو کر دیا ہے واپس میں نے

تاریکی میں اک بات بتاتا ہوں تمھیں
سنّاٹے میں اک راگ سُناتا ہوں تمھیں
وہ دُنیا کہ جس دُنیا میں، میں ہوں جیسے
میں نے اُسے دیکھا ہے دکھاتا ہوں تمھیں

باطل کے جو ماحول میں کہتا حق ہوں
میں چاک گریباں ہوں تو سینۂ شق ہوں
جاری ہیں وہ فلسفے کی بحثیں، لیکن
میں ہوں کہ تری یاد میں مستغرق ہوں

اک شاہ یہ بولا کہ محبّت کی تھی
سر آنکھوں پہ اک شوخ کی صورت لی تھی
بس میں نے محبّت میں حکومت ہی تو دی
سنتا ہوں کہ آدم نے تو جنّت دی تھی

جاناں سے رفاقت کا نتیجہ دیکھا!
کچھ تو نے محبّت کا نتیجہ دیکھا!
پھانسی کے اِن احکام کے آئینے میں
حاکم سے رقابت کا نتیجہ دیکھا!

جو حسن کا جادو ہے جگا دیتی ہے
اُلّو جسے چاہے وہ بنا دیتی ہے
معمولی سی چھوکری جو دل میں ٹھانے
اُنگلی پہ ارسطو کو نچا دیتی ہے

اُنگلی پہ حکیموں کو نچانے والی
میدان میں شاہوں کو لڑانے والی
جو ایسی قیامت کی ہے ہاں ہاں وہ ہی
کچھ دیر میں، دیکھنا۔ ہے آنے والی

شہزادی جو کل کرتی چھنن چھن نکلی
شاہوں میں رقابت ہوئی، آن بن نکلی
آج اُس کی ہی کھوپڑی میں انڈے دے کر
اِک آنکھ کے واڑے سے ناگن نکلی

ڈھانچوں سے پٹا پڑا ہے دیکھو تو کھنڈر
جس کھوپڑی پہ بیٹھا ہے کوّا آ کر
"اُس کی ہے" صدا آئی "کیا تھا اِک دن
قارون نے خزانے کو نچھاور جس پر"

آہٹ ہوئی، کھوپڑی میں چوہے جاگے
کیا دیکھ کے ہم آج کھنڈر سے بھاگے؟
اُس شوخ کا ڈھانچہ تھا کہ کل جوڑ کے ہاتھ
فرعون بھی جھک رہا تھا جس کے آگے

قرنوں کا جو اُس رُخ پہ طمانچہ دیکھا
ہم نے بدنِ ناز کا کھانچہ دیکھا
شاہوں میں لڑائی ہوئی جس کے باعث
اُس شوخ کا کل کھنڈر میں ڈھانچہ دیکھا

اے شوخ! یہ دُنیا ہے شعوری دُنیا
گر میں نہیں تیری ہے ادھوری دُنیا
تو میری ہے دنیا کا فقط اک حصّہ
اور میں تری پوری کی ہوں پوری دُنیا

اے جان! تری ہر بات میں، میں ہی میں ہوں
یعنی ترے دن رات میں، میں ہی میں ہوں
ہے میرے خیالات میں جانے کیا کیا
اور تیرے خیالات میں، میں ہی میں ہوں

کہنے ترے اِس دل نے ہیں مانے کیا کیا
گائے ہیں ترے واسطے گانے کیا کیا
اے شوخ! خیالات میں میرے لیکن
ہے تیرے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا

میں سوچتا ہوں رات میں جانے کیا کیا
پنہاں ہے ہر اک بات میں جانے کیا کیا
تُو تو یہ سمجھتی ہے کہ تو ہی تو ہے
ہے میرے خیالات میں جانے کیا کیا

چلتا ہوا یہ سانس دیا ہے کس نے؛
کیچڑ میں ہمیں دھانس دیا ہے کس نے؛
اِک چارہ و مادہ کا ہے چکّر جس میں
اِس طرح ہمیں پھانس دیا ہے کس نے؛

تھی اُس کی جو دل پسند خوئے مادہ
چارہ کھا کر چلا وہ سوئے مادہ
اِک فیل ہے اُس سمت روانہ، دیکھو
جس سمت سے آ رہی ہے بوئے مادہ

لکھتے تھے مُحبت کے وہ خط، سِلسِلہ تھا
بالکل تھا بجا، کب وہ غلط سِلسِلہ تھا!
لیلےٰ مجنوں کا عشق میرے نزدیک
ہاں اِک نر و مادہ کا فقط سِلسِلہ تھا

بُو سونگھ کے ایک سُو میں نکلا دیکھو
اِک عالم ہاؤ ہُو میں نکلا دیکھو
چارے کی تلاش سے نمٹ کر اِک فیل
مادہ کی ہے جُستجو میں نکلا دیکھو

ہم دونوں ہیں عِطر بیز، جانِ شیریں!
آہستہ، کبھی ہیں تیز، جانِ شیریں!
یہ رَدّ و بدل ساخت میں ہم دونوں کی
کس حد کی ہے مَعنی خیز، جانِ شیریں!

آئینے میں یہ تیرا سنورنا کیا ہے؟
ہر تیری ادا پر مرا مرنا کیا ہے؟
آپس میں ہماری یہ مُحبّت اے جان!
اِک ساخت کا ہے فرق، وگرنہ کیا ہے؟

جانی! یہ جو دل چاہ میں فریادی ہے
اِس سے ہی دل و روح کی آبادی ہے
یہ ہی تو ہے اِک وجہِ مُحبّت، اپنے
اجسام میں اِک فرق جو بنیادی ہے

یہ کونسے شعلوں کی تپش ہے اے شوخ!
کیوں اپنے دلوں میں خلِش ہے اے شوخ!
ہاں جسم میں میرے اور بدن میں تیرے
اِک فرق جو ہے وجہِ کشِش ہے اے شوخ!

اِک بات کہ تجھ سے مری ہر رات بنی
کتنی یہ حسین صورتِ حالات بنی
مجھ میں ہی سے ہو کے تجھ میں اِک شے تفریق
اِک حسن و محبت کی مساوات بنی

کہتی ہے ہر اک روئے صفی کی صورت
اعدادِ جلی اور خفی کی صورت
ہے حسن و محبت کی ریاضی کا سوال
جسموں میں یہ اثبات و نفی کی صورت

اے شوخ! ہے کب نفاق، مجھ میں تجھ میں
اِک وصل ہے اِک فراق، مجھ میں تجھ میں
اجسام میں اختلاف، میرے تیرے
ہے وہ ہی تو اتفاق، مجھ میں تجھ میں

آسودگیٔ جاں کی روِش ہے اور بس
جذبات کے شعلوں کی تپش ہے اور بس
دیوانگیٔ قیس برائے لیلیٰ
مادہ کی طرف نر کی کشش ہے اور بس

تو اتنی قریب ہے، جو دیکھا جائے
مستی کی نقیب ہے، جو دیکھا جائے
اور زندہ تقاضوں کی نفی کر کے یہ تن
بالکل ہی عجیب ہے۔ جو دیکھا جائے

اے شوخ! جبلت سے بھلے لگتے ہیں
اور حسن کے سانچے میں ڈھلے لگتے ہیں
کتنے ہیں عجب جسم ہمارے، اور ہم
ہوتے ہیں بغل گیر، گلے لگتے ہیں

جو چیز ہے مجھ میں، تجھ میں کب ہے اے شوخ!
جو مجھ میں نہیں تجھ میں وہ ڈھب ہے اے شوخ!
ہم دونوں کو یوں ایک کیا ہے جس نے
وہ صورتِ حالات عجب ہے اے شوخ!

خلعت میں ہیں سل کے ایک جانِ شیریں!
ہم پھول ہیں کھل کے ایک جانِ شیریں!
اجسام میں اثبات و نفی کے باعث
ہم دونوں ہیں مل کے ایک جانِ شیریں!

یہ صورتِ ہست و بود، ہے ہی کیا شے
یہ قامتِ صد قیود، ہے ہی کیا شے
اِک میری نظر کا زاویہ ہے، ورنہ
اے شوخ! ترا وجود، ہے ہی کیا شے

اے شوخ! ترے حسن کا افسوں کیا ہے؟
یہ جسم ترا، سوچ رہا ہوں، کیا ہے؟
یہ میری نگاہوں کے ہی پیچ و خم ہیں
تو کیا ہے؟ ترا قامتِ موزوں کیا ہے؟

سرشار تھی بوستاں میں شاخِ مستی
سرسبز تھی گلستاں میں شاخِ مستی
گو خواب میں نخلِ جاں تھا شب کو لیکن
بیدار تھی نخلِ جاں میں شاخِ مستی

ہاں گرچہ خلیج میں اُٹھے تھے طوفاں
پورے نہیں ہو پائے صدف کے ارماں
صحراؤں کی وسعت پہ گزشتہ شب میں
برسا تھا مگر زور سے ابرِ نیساں

کہتا ہوں، ہے جو کچھ کہ حقیقت میری
اے شوخ! بھلا کیا ہے محبّت میری
جتنی مجھے تیری ہے ضرورت، بالکل
اتنی ہی تجھے خود ہے ضرورت میری

اے شوخ! محبّت ہے ضرورت کیلئے
تیری ہے ضرورت مری خلوت کیلئے
اپنی راحت سے تیری راحت مجھ کو
بڑھ کر ہے فقط اپنی ہی راحت کیلئے

اے شوخ! ترے ہجر میں آہیں بھرنا
خود اپنے ہی آپ پر ہے گویا مرنا
اک یہ تو فقط ساخت کی مجبوری ہے
خود کو میں کلیجے سے لگا لوں ورنہ

کس دھوکے میں ہے، تجھ سے نہیں مجھ کو پیار
ہے ساخت کی حدبندی، یہ ظاہر ہے نگار
خود اپنے ہی رخسار کو چوموں کیونکر؟
اِس واسطے چومتا ہوں تیرے رخسار

بڑھتا ہوں کبھی، کبھی ہوں گھٹتا اے شوخ
کب راہِ محبّت میں ہوں ہٹتا اے شوخ!
تو تو یہ سمجھتی ہے کہ تجھ سے، دراصل
ہوں اپنے ہی آپ سے لپٹتا اے شوخ!

شعلوں کی ندی کو پار کرنے والا
گو تجھ پہ ہوں جاں نثار کرنے والا
اے شوخ! ترے لب پہ بہت ہی کس کر
میں خود کو ہوں خود پیار کرنے والا

عشق اور مجھے، تجھ سے؟ نگارِ گلفام!
خود اپنا میں عاشق ہوں، نہیں اِس میں کلام
تیرے لب و رخسار پہ، تو کیا جانے
میں اپنے ہی لے رہا تھا بوسے، کل شام

اِک عشق کا پیمان کیا تھا تجھ سے
"تو تو ہے مری جان" کہا تھا تجھ سے
خود کو تھا کلیجے سے لگایا میں نے
ظاہر میں بغل گیر ہوا تھا تجھ سے

دونوں کو، یونہی کچھ ہے کہانی، دشمن
اِک شوخ کی کرتی تھی جوانی دشمن
جسموں میں مماثلت تھی، جس کے باعث
قابیل تھا ہابیل کا جانی دشمن

ہم جنس سے اِس حد کی رقابت کیوں تھی؟
اور جنسِ مخالف پہ طبیعت کیوں تھی؟
قابیل نے ہابیل کو مارا کیوں تھا؟
اور آدم و حوّا میں محبّت کیوں تھی؟

تھا پیرہنِ حسن و محبّت سِلنا
تھا شاخ پہ دراصل کلی کا کھِلنا
حوّا کے جمالِ مختلف سے بڑھ کر
آدم کے وجودِ مختلف کا مِلنا

اے شوخ! ہوں گُل، بیچ رہی ہیں مجھ کو
قیمت سے ادا، بیچ رہی ہیں مجھ کو
جو مجھ میں نہیں ہیں ایسی چیزیں تجھ میں
ہاں تیری طرف کھینچ رہی ہیں مجھ کو

جذبات کی یہ آگ، تپش کا عالم
اے شوخ! چمن میں یہ رَوش کا عالم
اَعضا کا بَلا خیز تناسُب تیرے
اُفوہ! تری جنسی کشش کا عالم

کہہ دوں؟ وہ جو ہے تلخ حقیقت اے شوخ!
تو جانتی ہے اُس کو محبّت اے شوخ!
اِس جسم کو میرے جو بہ شدّت ہر شب
ہے تیرے بدن کی جو ضرورت اے شوخ!

بے لاگ ہیں، بے لاگ رہے ہیں دونوں
اِک ساتھ ہی ہم جاگ رہے ہیں دونوں
کون آگے رہے، کون پیچھے، کس سے پوچھوں
ہم دائرے میں بھاگ رہے ہیں دونوں

تھی صورتِ حالات رسیلی اِتنی
اے شوخ! مئے شوق جو پی لی اِتنی
آپس میں ہماری وہ گرفتِ مضبوط
اِک آن میں کیوں پڑ گئی ڈھیلی اِتنی

اے شوخ! بہت تیز نکل کر پہنچی
مجھ میں سے بہ شدّت وہ اُبل کر پہنچی
وہ ایک شرارہ بھی عجب تھا، تجھ تک
جو تارِ مُحبّت پہ تھا جل کر پہنچی

اے شوخ! قیامت کی نشانی تُو ہے
جاری رہے جو، ایسی کہانی تُو ہے
میں تیرے ہی گرداب میں بجھ جاؤں گا
میں جو ہوں اگر آگ تو پانی تُو ہے

خود آگ تھا، جل رہا تھا میرا جوہر
لاوا تھا، اُبل رہا تھا میرا جوہر
جتنا اُسے روکنا تھا چاہا میں نے
اتنا ہی نکل رہا تھا میرا جوہر

ہم دونوں کے اِن ٹوٹے دلوں نے جُڑ کر
اے شوخ! بہار آئی جو دیکھا مُڑ کر
جگنو کہ مری شاخ پہ چمکا اور پھر
پتّے پہ ترے چمن کے پہنچا۔ اُڑ کر

انوار کے اِک جہان کو دیکھا ہوتا
تخلیق کے کاروان کو دیکھا ہوتا
جب پیٹ میں اپنی ماں کے میں تھا میں نے
اے کاش کہ اپنی ماں کو دیکھا ہوتا

ہے نشو و نمائے خاص اِس کی غمّاز
اُس شوخ کے اب پاؤں ہیں بھاری ہمراز!
اب اُس میں شرارت کے نہیں ہیں تیور
اب اُس میں متانت کا نیا ہے انداز

ہیں اُس کے خد و خال چمکتے، دیکھو
اِک نور ہے، سب پہلو دمکتے دیکھو
اِس کے، جسے کچھ روز میں ماں بننا ہے
اِک جسم میں دو دل ہیں دھڑکتے دیکھو

اُمید سے وہ شوخ ہے، گر جائزہ لیں
ہم جاہ و جلالِ شاہ و رداد دیکھیں
اور تاج نمودارِ شکم پر رکھ کر
پہلے ہی سے اُس کی تاجپوشی کر دیں

کس ناز سے نازوں کی پلی آئی ہے
بن کر وہ یہاں نقشِ جلی آئی ہے
شاید کوئی تصویر ہے زندہ ہو کر
غاروں سے اجنتا کے چلی آئی ہے

۱۳۵

اِمکاں کی ہر حد کو نہ چھو پاتا تھا
کچھ حد سے سوا حسنِ نمو پاتا تھا
غاروں میں اجنتا کے، میں تصویروں میں
تجھ سے نہ ملا تھا تو غلو پاتا تھا

شک گزرا ہے، دیکھا جو تری صورت کو
لنکا کی طرف سے جو چلے مورت کو
بھگوان نے چھو دیا تھا، زندہ کرنے
شاید کہ ایلورا میں کسی مورت کو

اِک پل ہی میں تو بن گئی، جانِ گلفام!
دیوار سے نکلی تو ہوئی مستِ خرام
تصویر میں رانی کی۔ اجنتا جا کر
اِک روح جو بھگوان نے پھونکی کل شام

تو ہے کہ ایلورا کی کوئی مورتی ہے
اتنی جو بدن کی ترے خوبصورتی ہے
اعضائے سنودار کی گولائی سے
رہ رہ کے تری جنسی کشش گھورتی ہے

یہ جسم ہے تیرا کہ قیامت، چندا!
مت پوچھ کہ کیا سوچ رہا ہے بندہ؟
ہے جو ترے پیکر میں کشش کا چکر
اِک پست و بلند کا ہے گورکھ دھندا!

ہاں ہاں! یہ شریر ہے بہت ہی پوشاک
اے شوخ! بڑی شوخ ہے تیری پوشاک
بھرپور بدن پر ترے چسپاں ہو کر
کھاتی ہے خطوطِ تن کی چغلی پوشاک

ظاہر ہے وہ ہلچل جو ہے اندر اے شوخ!
ہے تیرا بدن مست قلندر اے شوخ!
پوشاک کے ساحل میں سمائے کیونکر؟
یہ تیری جوانی کا سمندر اے شوخ!

چل کر یہاں آنے کا قرینہ تیرا
کیا عطر و گلاب ہے؟ حسینہ تیرا
میرے لیئے قاتل ہے، شلوکے پہ ترے
بغلوں سے جو رِستا ہے پسینہ تیرا

بالکل ہی خفی، ہم کو کلی لگتی ہے
بن جاتی ہے جب پھول، بھلی لگتی ہے
جس عمر سے آتی ہے جوانی، اُس سے
ہو جاتی ہے دُگنی تو بھلی لگتی ہے

دیتی ہے مزہ، جب ہو کہانی آدھی
پوشاک ہو اُودی اور دھانی آدھی
صورت میں حسینوں کی ہیں معنی آتے
جب اُن کی گزر جائے جوانی آدھی

پھر اُس میں اِک آغازِ کمال ہوتا ہے
صورت سے معانی کا وصال ہوتا ہے
معراجِ شباب پر پہنچ کر جب حُسن
جس دن سے کہ مائل بہ زوال ہوتا ہے

جو حرف شراب میں نہیں ہے آتا
وہ اپنی کتاب میں نہیں ہے آتا
مکھڑے پہ کسی شوخ کے کچا پن ہو
تو اپنے حساب میں نہیں ہے آتا

کہتے ہیں: "ہو صادقین کیسے!" اتک
کچھ خوردی بزرگی نہیں جیسے اتک
کیوں مجھ سے یہ نوخیز حسین بولتے ہیں؛
جیسے کہ برابر کا ہوں ایسے، اتک

ہاں ہوتے ہیں حشر خیز کتنے چہرے
ساغر میں ہیں جلوہ ریز کتنے چہرے
نوخیز و شگفتہ رخ ہیں آبِ شفاف
ہیں مجھ کو شرابِ تیز کتنے چہرے

اُس نے، جو تعارف ہوا، کیسے دیکھا
مجھ کو، میں بتاتا ہوں کہ جیسے دیکھا
اِک آن، سرِ بزم ملا کر آنکھیں
جیسے کہ وہ شیرنی ہو ایسے دیکھا

میں سادگیِ حسن پہ کب ہوں مائل؛
پُرکاری کا پردہ نہ ہو جب تک حائل
اِک شیرنی کی چھب سے کہ آنکھیں دیکھیں
میں چشمِ غزالاں کا نہیں ہوں قائل

چلّے میں تھی تیر جوڑے، مجھ کو دیکھا
پھر تیر پہ تیر چھوڑے، مجھ کو دیکھا
کل بزم میں، نیم رُخ بھی رہ کر، اُس نے
گردن کو بغیر موڑے، مجھ کو دیکھا

گھونگٹ کو بڑھائے گی، نہ دیکھا میں نے
نظروں کو جھکائے گی، نہ دیکھا میں نے
اُس شوخ کو محفل میں، اِس اندیشے میں
وہ آنکھ چرائے گی، نہ دیکھا میں نے

وہ تیکھے خد و خال نکھارے دل میں
وہ گیسوئے خم دار سنوارے دل میں
نظروں میں ہیں کس کس کے کتابی چہرے
کس کس کے ہیں نیم رُخ ہمارے دل میں

ہاں دل کے گداز کی بدولت دل پر
کتنا ہے جلی نقشِ حقیقت دل پر
یہ ناک یہ نقشہ ہے نہ جانے کس کا!
اِک سایۂ نیم رُخ کی صورت دل پر

وہ سایہ خیالات پہ چھایا۔ دیکھا
پھر دل پہ وہ نقش بن کے آیا، دیکھا
جب دیکھ کے اُس کا وہ کتابی چہرہ
دیوار پہ نیم رُخ کا سایا دیکھا

روشن ہے ترا اخترِ شہابی! چہرہ
مے سے ہے شباب کی شرابی چہرہ
ترشا ہوا نیم رُخ تو بانکا جوڑا
موڑا جو ذرا تو نے کتابی چہرہ

تھا میرے مخاطبے سے آبی چہرہ
تھا سانولا، ہو گیا گلابی چہرہ
وہ اجنبی، نیم رُخ تھی، میں نے "سنیئے"
جیسے ہی کہا۔ دیکھا کتابی چہرہ

جیسے ہی گئی نگار پہنے بُرقع
تنہائی میں سایوں کا گھنا تھا مجمع
پھر اُس کے وہ جاتے ہی ہوا تھا معلوم
ویرانیٔ پہلو کا حدودِ اربع

اے شوخ! وہ چھٹ رہے ہیں بادل دیکھو
آکاش سے چھٹ رہے ہیں بادل دیکھو
پردوں کو تکلف کے اُٹھایا جائے
مہتاب سے ہٹ رہے ہیں بادل، دیکھو

بھرپور شباب ہے، وہ نِکلا مکھڑا
کتنی تب و تاب ہے، وہ نِکلا مکھڑا
جزدان سے جیسے کہ صحیفہ نکلے
کچھ ایسے نقاب ہے، وہ نِکلا مکھڑا

"گورے بھی تو یہ گال نہیں ہیں میرے"
"گھونگر کے بھی تو بال نہیں ہیں میرے"
سُننے کو بہت خوب ہیں" مجھ سے بولی:
"کچھ خاص خد و خال نہیں ہیں میرے"

دِل خون ہے، ہم عشق کے مزدوروں کا
آگے ترے وہ رنگ اُڑا حوروں کا
اِس سانولے مکھڑے میں یقیناً شامل
ہلکا سا ہے کچھ رنگ بھی انگوروں کا

ہم فرش کریں قلب و نظر، بات کریں
جو اُن کی ہو مرضی کی وہ ہر بات کریں
ہم پوری طرح گوش بر آواز رہیں
علّامہ حسینوں کی اگر بات کریں

علّامہ دکھاتے ہیں فلک کے اسرار
ہیں میرے تصوّر میں وہ زُلف و رُخسار
مابعد طبیعات کے لاکھوں نکتے
اُس گال پہ چھوٹے سے مُہاسے پہ نثار

اِس عمر کی کتابِ بے نقابی تِل ہے
میں سمجھا کہ یہ کوئی شرابی تِل ہے
یہ گال پہ چھوٹا سا مُہاسا، تیرے
میری تو نظر میں اِک گلابی تِل ہے

مشّاطہ کا دم رُوئے حسیں پر نکلا
فِطرت کا کرم بن کے جبیں پر نکلا
اُس شوخ کے ماتھے پہ مُہاسا چھوٹا
بِندیا جہاں لگتی ہے وہیں پر نکلا

علّامہ سے ملنے کے لیئے جاتا تھا
دل نُور سے پُر اپنا کیئے جاتا تھا
اور راہ میں اِک جاننے والی جو ملی
گھر لے گئی اپنے تو پیئے جاتا تھا

پیمانۂ گلِ تر سے چھُوا تھا میں نے
گیسوئے مُعَطّر سے چھُوا تھا میں نے
کل، باتوں ہی باتوں میں جو پی کر، اُس کے
ہونٹوں کو بھی ساغر سے چھُوا تھا میں نے

دل میرا، بہر کیف وہ رکھ لیتی ہے
اشیار کی حقیقت کو پرکھ لیتی ہے
دیتی ہے مجھے جام تو اُس سے پہلے
تھوڑی سی کنارے پہ وہ چکھ لیتی ہے

اِک جامِ شراب کی کسر تھی باقی
اِک بندِ نقاب کی کسر تھی باقی
وہ حسن کا عالم بھی عجب تھا، جس دم
ہلکے سے حجاب کی کسر تھی باقی

اُس شام وہ تریں درد سہنا اُس کا
میں پاس ہوا تو دُور رہنا اُس کا
مجھ سے، ذرا شرما کے، "طبیعت میری
کچھ آج ہے ناساز" یہ کہنا اُس کا

تھا حُسن کا اُس کے ساز، بدلا بدلا
تھا دیدۂ نیم باز، بدلا بدلا
اُس شوخ کا ہاں آج نہ جانے کیوں تھا،
اندازِ خرامِ ناز، بدلا بدلا

اِک رابطہ قائم جو ہے ہم سے اَب تک
وابستہ ہیں زُلفوں ہی کے خَم سے اَب تک
جتنا بھی ہے یہ ذہنی توازُن اپنا
قائم ہے حسینوں کے کرم سے اَب تک

جیسے خَسَم کا گُل میں صبا شامل ہے
ایسے ہی دعاؤں میں شِفا شامل ہے
کیوں حال ہمارا نہ ہوا اچھا اے دوست!
جب اِس میں حسینوں کی دُعا شامل ہے

کب تابِ نفس رہی ہے میرے دل کو
پیچوں میں وہ کس رہی ہے میرے دل کو
ناگن سی ہے پیکر کی لچک میں تیرے
پھنکار کے ڈس رہی ہے میرے دل کو

اے شوخ! میں مجبور ہوں آجاتا ہوں
پھل، گرتا زمیں پر ہے یہ سمجھتا ہوں
ہاں تیری طرف جنسی کشش کے باعث
میں کیا کروں، کھنچتا ہی چلا آتا ہوں

گہری ہے، یہ جو دل میں خلش ہے اے شوخ!
اک شعلہ ہے، حدت ہے، تپش ہے اے شوخ!
جیسے کہ پٹاری میں ہو ناگن، ایسے
پیکر میں ترے، جنسی کشش ہے اے شوخ!

ہوں راز تو راز کے علاوہ کیا ہوں؟
اک عارفِ ساز کے علاوہ کیا ہوں؟
میں، تو جو اگر حسن کی سارنگی ہے
سارنگی نواز کے علاوہ کیا ہوں؟

بیلوں کے خم و پیچ، چمن میں ترے
کوندی ہوئی بجلی کہ ہے تن میں ترے
جو کھائے تھے ناگن نے ہوئے ہیں تبدیل
ناگن کے وہ لہریئے بدن میں ترے

وہ جملہ حجابات کے اُٹھّے پردے
میں تیرا بدن دیکھ رہا ہوں ایسے
غرناطہ و قرطبہ کا جیسے سیّاح
پہلی ہی دفعہ تاج محل کو دیکھے

خلوت میں ہے اس وقت وہ جانِ محفل
ملبوسِ سیہ فام سے۔ نورِ کامل
نکلا۔ تو تہِ موجۂ آبِ حیوان
ظلمت کا ہے چھوٹا سا جزیرہ اک دل!

کل حسن نے جس وقت مری مان لی بات
ظاہر ہوئے کھلتے ہوئے عقدوں کے نکات
اُٹھتے ہی حجابِ آخری کے دیکھی
آغوشِ سحر میں مختصر سی اک رات

خلوت ہی میں سازِ حسن ہوگا اور میں
اک نغمۂ رازِ حسن ہوگا اور میں
یہ بندِ غرورِ حسن، جس دم ٹوٹا
سیلابِ نیازِ حسن ہوگا اور میں

اے کاش کہ وہ گھڑی بھی دیکھیں اک شب
ہم حسن کی روشنی بھی دیکھیں اک شب
تیور وہ غرور کا تو دیکھا اک روز
اندازِ سپردگی بھی دیکھیں اک شب

خلوت ترے دم سے ہے خزانہ اے شوخ!
تو کیا ہے؟ حقیقت کہ فسانہ؟ اے شوخ!
گلدستے پہ لپٹا ہوا عکسی کاغذ
ہلکا سا یہ ملبوسِ شبانہ، اے شوخ!

لپٹی ہوئی، شکنوں میں قیامت کیا تھی؟
آنکھیں تھیں، چکا چوند، وہ صورت کیا تھی!
چادر کو جو پیکر سے گرایا، اُس نے
اک بقعۂ انوار تھی، خلوت کیا تھی!

پیڑوں کی جو کل اوٹ میں چھپ کر اک حور
آئی سیہ پوشاک میں، بیٹھی کچھ دور
ظلمت کے حجاب سے، بالآخر نکلی
اک آبِ حیات کی وہ موج پُر نور

کل چھپ کے وہ آ گئی تو شب تھی رنگیں
اور شمع وہ بجھتے ہی جو رکھی تھی قریں
خلوت میں تھا ظلمات کا عالم، جس میں
وہ آبِ حیات کی تھی موجِ شیریں

کھلتی ہوئی کلیاں ہیں، چمن کی تیرے
رنگین سی روشنی ہے، تن کی تیرے
خلوت کی ہر اک شے پہ ہے ہلکی ہلکی
چھلکی ہوئی چاندنی، بدن کی تیرے

وہ حسن نمایاں ہے بدن سے تیرے
ہر چیز درخشاں ہے بدن سے تیرے
اک تو جو نہ ہوتی تو اندھیرا ہوتا
خلوت میں چراغاں ہے بدن سے تیرے

باتوں میں وہ کھو گئی، تعجّب یہ ہے
زانو پہ وہ سو گئی، تعجّب یہ ہے
جو بات کہ ہونی ہی نہیں چاہیئے تھی
وہ بات بھی ہو گئی، تعجّب یہ ہے

لکھا ہوا راز ہے، سحر کے ہنگام
وہ سوز ہے ساز ہے، سحر کے ہنگام
جو شام تھی نقشِ ناز، ہاں ہاں وہ ہی
تصویرِ نیاز ہے، سحر کے ہنگام

کل رات وہ طمطراقِ حسنِ مغرور
وہ طنطنہ الاماں، وہ تیور بھرپور
بیدار رہا، آخرِ شب تک، لیکن
اِک عجز و نیاز و انکساری کا شعور

اُس شوخ کی، جس کا نہ ہے ثانی نہ عدیل
باتیں مری مانتے ہیں، اِتنی تعجیل
حیراں ہوں کہ وہ ناز کی صورت کیونکر؟
تصویرِ نیاز میں ہوئی ہے تبدیل

اے شوخ! میں ہوں قول میں اپنے صادق
اِک صورتِ حالات کا میں ہوں خالق
تو مجھ پہ فریفتہ ہوئی تھی جس شام
اُس شام سے میں تیرا نہیں ہوں عاشق

اِس بات کے کہنے میں کہ پورا ہے وثوق
اے شوخ! یہ کیسی ہے خدا کی مخلوق؟
کل تو ہی تو معشوق تھی، عاشق مَیں تھا
اور آج تو عاشق ہے تو مَیں ہوں معشوق

اب تیرا ہے التفات، قیمت میری
عاشق کی سی اب کہاں ہے حالت میری؟
تھی تیرے تغافل کی حدوں میں زندہ
وہ تجھ سے بلاخیز محبت میری!

آدابِ تغافل کو اُٹھا دیتی ہے
خود راہ میں آنکھوں کو بچھا دیتی ہے
میں تو ترا عاشق ہوں ولیکن اکثر
تو خود مجھے معشوق بنا دیتی ہے

۱۵۱

سب راز بتا دیئے تھے، اِک اِک کر کے
سب پہلو دکھا دیئے تھے، اِک اِک کر کے
خلوت میں، حجابات تھے جتنے، سب ہی
کل اُس نے اُٹھا دیئے تھے، اِک اِک کر کے

مطلب ہے، شباب کی یہ ہلچل دیکھو
اِس حسنِ بلاخیز کا کس بل دیکھو
سینے سے سرکتا ہوا اُس کے خود ہی
قدموں پہ وہ آپڑا ہے آنچل، دیکھو

طوفان ہے، موجِ زندگی بھی دیکھو
ہیں نور کے بقعے، روشنی بھی دیکھو
آنکھوں میں یہ کہا اُس نے، گرا کے آنچل
اعضائے بدن کی دلکشی بھی دیکھو

یہ بر، یہ بغل، یہ کوکھ، اُبھر پر اے جان!
مکھن سے شکم پہ نافِ ہیجان کا سماں
کھلتے ہی گرہ اور جو سرکی پوشاک
شکنوں کے کمر پہ ہیں گلابی سے نشان

تانبے کی سی رنگت تھی، نہیں تھا گورا
اِک خاص ہی رقبۂ جبیں تھا گورا
ساحل سے، وہ چھٹیاں مناکر آئی
تو جسم تھا سانولا، کہیں تھا گورا

ساحل سے، وہ کرنوں کو سمو کر آئی
اِک ماہ وہاں دھوپ میں سو کر آئی
دیکھا تو کہیں کہیں تھی، بالکل گوری
ویسے تو بہت سانولی ہو کر آئی

ساحل سے، وہ آگئی، بُلا کر دیکھیں
یہ شکل ہو، پردے جو ہٹا کر دیکھیں
جیسے پڑیں کتھئی پھواریں اور پھر
ترشے ہوئے کاغذ کو اُٹھا کر دیکھیں

اُس شوخ کا، اے دل، جو ہے دم خم، مت پوچھ
کیوں اب وہ ہوئی حسنِ مجسّم، مت پوچھ
تعطیل، جنوب سے منا کر آئی
گالوں پہ وہ چتّیوں کا عالم، مت پوچھ

چھلکے

اے شوخ! میں خود مست ہوا جاتا تھا
جو گام تھا، وہ جست ہوا جاتا تھا
کل جسم مرا اور یہ بدن بھی تیرا
آپس میں جو پیوست ہوا جاتا تھا

پھر رک گیا چل کے، منتظر تھا تیرا
میں خوب سنبھل کے منتظر تھا تیرا
میں شدتِ شوق میں، ذرا کچھ تجھ سے
آگے جو نکل کے منتظر تھا تیرا

کس طرح بھلا برقِ تپاں کو روکوں؟
چھوٹے ہوئے، تیرِ بے اماں کو روکوں؟
کچھ بس ہی نہیں، پھر بھی مگر فکر یہ ہے
اب کیسے نکلتی ہوئی جاں کو روکوں؟

اُف جادۂ مستی پہ روانی تیری
بجلی کی سی رفتار ہے جانی! تیری
اک آن میں اے جان! اُبل جائیگی
جذبات کے شعلوں پہ جوانی تیری

تو نقش ہے، چمن میں رنگ بھرتا میں ہوں
بنتا ہوں، بگڑتا ہوں، سنورتا میں ہوں
تجھ کو لیے آغوش میں، اُفتاں خیزاں
تلوار کی دھار سے گزرتا میں ہوں

اِک لمحۂ نیم شب پہ، رُک جاتا ہوں
کچھ تیرے، کچھ اپنے ڈھب پہ، رُک جاتا ہوں
آثار جو منزل کے نظر آتے ہیں
اے جان! امیدِ طرب پہ رُک جاتا ہوں

ایسے میں کہ خود حسن ہوا ہو گُل ریز
رُک جائیں تو پھر شوق لگائے مہمیز
ہم جادۂ مستی پہ چلے جاتے ہیں
آہستہ، کبھی تیز، کبھی بہت ہی تیز

پانی سا برستا تھا، چمن میں تیرے
بجلی سی چمک رہی تھی تن میں تیرے
جذبات کی دہکی ہوئی وہ آگ مگر
اِک آن میں بجھ گئی، بدن میں تیرے

کل رات لچک کر وہ سرہانے، کیا کیا
خلوت میں چلی رنگ دکھانے، کیا کیا
اِک خاصِ تمنّا کی نظر سے، مجھ سے
آنکھوں ہی میں کہتی تھی، نہ جانے کیا کیا؟

جذبات سے لبریز وہ ساغر کر کے
آئینے میں بیدار وہ جوہر کر کے
پہلو میں، بہ صد ناز، لچک کر بیٹھی
وہ بندِ قبا کو میری زد پر کر کے

اِک جامِ شراب تھا، جو باقی رکھا
باقی وہ حباب تھا، جو باقی رکھا
کل جملہ حجابات اُٹھا کر، اُس نے
تھوڑا سا حجاب تھا، جو باقی رکھا

خلوت میں وہ کل رات میں رہنا اُس کا
جذبات کی خاص رَو میں بہنا اُس کا
اور صورتِ حالات کے اِک موڑ پہ پھر
"دیکھیں کوئی دیکھ لے گا" کہنا اُس کا

"خود آپ ہی سمجھیں تو مرا کیا ہوگا؟"
"دل میں ذرا سوچیں تو مرا کیا ہوگا؟"
ترغیب مجھے دے کے، یہ اُس کا کہنا:
"کچھ ہو گیا دیکھیں تو مرا کیا ہوگا؟"

وہ بات کہ رُو بَرُو، جو تجھ سے کی تھی
اُس بات میں تھا غُلو، جو تجھ سے کی تھی
اُس کو کوئی سُن لے تو ہنسے گا کتنا
تنہائی میں گفتگو، جو تجھ سے کی تھی

آپس میں محبّتیں ہماری کیا تھیں؟
خلوت میں وہ راحتیں ہماری کیا تھیں؟
اے شوخ! یہ محفل میں خیال آتا ہے
تنہائی میں حرکتیں ہماری کیا تھیں؟

ہو جاتے جو بیدار ہیں، کرتے کیا ہیں؟
ہم اور، فقط پیار ہیں، کرتے کیا ہیں؟
اے شوخ! ذرا سوچ تو سب سے چُھپ کر
ہم دونوں سمجھدار ہیں، کرتے کیا ہیں؟

شہزادی، یہیں ہار کے آ پہنچی ہے
ٹھوکر پہ محل مار کے آ پہنچی ہے
درویش کی کوٹھری میں خدمت کرنے
شہزادوں کو دھتکار کے آ پہنچی ہے

"شہزادی! فقیروں کے یہاں کچھ بھی نہیں"
"کیوں آئی ہو؟ پیروں کے یہاں کچھ بھی نہیں"
یہ سن کے، وہ خاکِ کفش، رُخ پر مَل کر
بولی کہ "امیروں کے یہاں کچھ بھی نہیں"

"شہزادی! یہاں آئی ہو، دل ہلتا ہے"
بولی کہ یہیں غنچۂ دل کھلتا ہے
کٹیا میں جو آتی ہوں تو مل جاتا ہے
جو کچھ مجھے محلوں میں نہیں ملتا ہے"

پہنچے ہوئے پیروں کی بلائیں لینے
بدلے میں وفاؤں کے وفائیں لینے
ٹھکرا کے امیروں کے وہ ہیرے کل شب
آئی تھی فقیروں کی دعائیں لینے

خرّم نے جو گلفام کو ہیرا کیا پیش
بولی کہ یہ شہزادہ نہیں صاحبِ کیش
ٹھکراتے ہی کٹیا کی طرف شہزادی
اک پھول لیئے آئی برائے درویش

کل اس نے فقیروں کی مدارات جو کی
کٹیا میں، یہیں ساتھ بسر رات جو کی
اس رات کی واردات، اللہ اللہ
سو باتوں کی اک بات تھی وہ بات جو کی

گلفام پہ ظاہر ہے عتابات ہیں کیوں
بیچاری سے نظروں میں سوالات ہیں کیوں
کٹیا میں جو ہو رہا ہے، بالکل ویسے
شہزادی کے پیکر پہ نشانات ہیں کیوں!

شہزادے نے کچھ بھی نہیں رستا سمجھا
اور ظلِّ سبحانی نے بھی خستہ سمجھا
ہم مست قلندروں کو لیکن اے دل!
شہزادی نے کلیان کا رستہ سمجھا

ہاں حسن کا، دل پر جو فسوں ہے سقراط!
تو مجھ کو محبت کا جنوں ہے سقراط!
وقت آگیا اک شوخ سے ملنے کا ارے
جاتا ہوں مجھے روکتا کیوں ہے سقراط؟

جاتا ہوں کہ وعدہ ہے کہیں ملنے کا
ورنہ نہیں پھر ایسا حسیں ملنے کا
اُس شوخ سے لازمی ملوں گا، لیکن
میں بُوعلی سینا سے نہیں ملنے کا

میں بور تھا سُن کے رات، چکّر کیا ہے
آئی نہ سمجھ میں بات، چکّر کیا ہے
اِن پر یہ بڑی دیر سے کیوں ہے تقریر
یہ کیا ہیں صفات و ذات؟ چکّر کیا ہے؟

رنگین تھیں مکھڑوں سے جو ساری راتیں
وہ مجھ سے حسینوں کی نرالی گھاتیں
بے ساختہ یاد آئیں تھیں، میں نے تا دیر
کل عالمِ بالا کی سُنیں جب باتیں

ہیں پھول تخیُّل میں، مسَل ڈالے گی
کلیاں ہیں خیالوں میں کچل ڈالے گی
علّامہ کی تقریر تو سُن لوں۔ لیکن
جاناں کے تصوّر میں خلل ڈالے گی

محبوب سے مُنہ موڑ کے ہم جائیں گے؟
یوں اپنا ہی دِل توڑ کے۔ ہم جائیں گے؟
علّامہ کی فلسفے پہ سُننے تقریر
جاناں کو بھلا چھوڑ کے۔ ہم جائیں گے؟

کی اُن کے ہر اک غلُو پہ "جی جی" میں نے
تقریر کے اُس علُو پہ "جی جی" میں نے
وہ سمجھے کہ سُنتا ہے کچھ ایسے کی تھی
علّامہ کی گفت گُو پہ "جی جی" میں نے

اک جال خیالات کا بُنتا ہوں میں
یادوں کے جو موتی ہیں وہ چُنتا ہوں میں
علّامہ کی گفتگُو پہ "جی جی" کہہ کر
بس اِتنا دکھاتا ہوں کہ سُنتا ہوں میں

کہلایا کہ بیٹھیں ہم جو آئے، اُس نے
حمّام میں پھر رنگ لگائے، اُس نے
گیسو ہی بنانے پہ نہیں ہے موقوف
آئینے میں تیور بھی بنائے اُس نے

میرے دلِ پامال کو دیکھا اُس نے
پروے میں مرے حال کو دیکھا اُس نے
آئینۂ حمّام میں، چلتے چلتے
جب پھر سے خد و خال کو دیکھا اُس نے

ہر نقشِ حسیں اور اُبھارا اُس نے
مکھڑے کو بھی کچھ اور نکھارا اُس نے
آگے مرے، آ کے بیٹھنے سے پہلے
زلفوں کو کئی بار سنوارا اُس نے

اب اپنی زباں پر تو فقط ہے فریاد
آوارہ خیالات ہیں، دِل ہے برباد
پتھر سے جو دِل کو موم کردے، اُس نے
آئینے میں وہ ادا بھی کرلی ایجاد

خوشبوئے بہار کا تکلّف کیوں ہے؟
مکھڑے کے نکھار کا تکلّف کیوں ہے؟
ہم سے بھی مُلاقات کی خاطر، اے جان!
یہ اتنا سِنگھار کا تکلّف کیوں ہے؟

اُف کتنی بہار میں، سحر سے وہ ہے
مکھڑے کے نِکھار میں، سحر سے وہ ہے
ہلکی سی، سرِ شام دکھانے کو جھلک
مشغولِ سِنگھار میں، سحر سے وہ ہے

بُت ساز کو ہے فہم کہ صُورت کیا ہے
نقاش کو ہے عِلم کہ صُورت کیا ہے
پھر ہم سے ملاقات کی خاطر، تم کو
اِس حد کے سِنگھار کی ضرورت کیا ہے؟

جب میری تھی مُنتظر تو حالت کیا تھی
اُف سولہ سِنگھار میں وہ صورت کیا تھی
اُس شوخ سے آتے ہی کہا تھا میں نے
ہم سے یہ تکلّف کی ضرورت کیا تھی

رباعیات

ملنے گیا، ہرچند کہ کم تھا کل وقت
تنہا مرا شہ نشیں میں گزرا کل وقت
حمّام میں کرتی رہی ضائع، وہ شوخ
آرائشِ کاکل میں بہت سا کل وقت

بادل میں اگر وہ تو زمیں میں، میں ہوں
کھویا ہوا اک خوابِ حسیں میں، میں ہوں
حمّام میں، آرائشِ کاکل میں ہے وہ
تنہا یہاں اُس کی شہ نشیں میں، میں ہوں

جب ملنے گیا اُس سے بہ حسنِ تدبیر
حمّام میں تھی، حسن کی عریاں شمشیر
تادیر، وہ شہ نشیں میں، میں نے اُس کی
رکھی ہوئی کارنس پہ دیکھی تصویر

کاموں سے نکال کر ذرا سی مہلت
ملنے جو گیا کل تو بہت تھی عجلت
حمّام میں اُس شوخ کو لیکن افسوس
آرائشِ کاکل سے نہیں تھی فرصت

کس نے کہا؟ آرائشِ صورت مت کر
کس نے کہا؟ زیبائشِ قامت مت کر
خوبصورتی تیری، ہے امانت حق کی
اے شوخ! امانت میں خیانت مت کر

اپنے قد و قامت کو سجا کر لائی
گلدستہ وہ زلفوں کو بنا کر لائی
میں رہ گیا، گہری سانس بھر کے، خاموش
خوشبو میں وہ جب خود کو بسا کر لائی

وہ بن کے قیامت آئی، میں نے دیکھا
آنکھوں میں مری سمائی، میں نے دیکھا
پھر اُس کے بدن کا حُسن، مجھ سے اُس نے
جیسے ہی نظر بچائی، میں نے دیکھا

رنگ اپنا سوا، نورِ سحر سے دیکھا
مکھڑے کو حسین تر، گلِ تر سے دیکھا
آئینے میں، کل مجھ سے وہ بچ کر اُس نے
خود کو جو ذرا میری نظر سے دیکھا

حالات کی گردش سے بڑی ہے تشویش
دل رکھنے کی کوشش سے بڑی ہے تشویش
کل جس کے تغافل نے کیا تھا بے چین
آج اُس کی نوازش سے بڑی ہے تشویش

آئی نہ سمجھ میں بات، اِتنا کیوں ہے؟
میرے لیئے دن بھر رات، اِتنا کیوں ہے!
کل اُس کا تغافل تو بجا تھا، لیکن
آج اُس کا یہ التفات، اِتنا کیوں ہے؟

گُن گاتی وہ اب لگاتار مرے کیوں ہے؟
گھر آتی وہ بار بار مرے کیوں ہے!
کل جس کو بس اک پھول دیا تھا میں نے
وہ آج گلے کا ہار مرے کیوں ہے!

اِس اپنے مذاق سے بہت ہی خوش ہوں
اب اُس کے نفاق سے بہت ہی خوش ہوں
کل جس کے وصال کی تھی حسرت مجھ کو
آج اُس کے فراق سے بہت ہی خوش ہوں

پھر عاشقی کل رات ہوئی تھی تجھ سے
پھر پیار کی ہر بات ہوئی تھی تجھ سے
ہاں دوستی کیا خبر تھی اِتنی ہو گی
جب پہلی ملاقات ہوئی تھی تجھ سے

اِک صورتِ حالات بہر طور ہوتی
وہ بھی یونہی کرتی ہوئی کچھ غور ہوتی
ہاں تو مری محبوب ہے، شک ہی کیا ہے
گر تو نہیں ہوتی تو کوئی اور ہوتی

کیا غنچۂ آرزو نہ کھلتا؟ اے شوخ!
کیا پیرہنِ شوق نہ سِلتا؟ اے شوخ!
ترے لیے اجنبی ہی رہتا، اِک شام
اِک موڑ پہ تجھ سے جو نہ ملتا اے شوخ!

نقش ہو کے یہ زندگی اُبھر ہی جاتی
اِک زلف مرے دل میں سنور ہی جاتی
تو ہے تو بہت خوب، و گرنہ اپنی
یوں ترے بغیر بھی گزر ہی جاتی

ہر گوشے میں، اک رنگِ حِنائی گھُل جائے
تو اپنی ہی نظروں میں یکایک تُل جائے
حمّام میں، جیسے ہی قدم تو رکھ دے
آئینۂ حمّام کا جوہر کھُل جائے

حمّام میں اُس کے، ہیں فسانے کیا کیا
آئینوں میں ہیں، رنگ سُہانے کیا کیا
گوشے میں سنگھار کے ہزاروں سامان
لٹکا ہوا کھونٹیوں پہ، جانے کیا کیا!

خوشبو سے، وجُود کو مُعطّر کر کے
آئینے میں، مکھڑے کو گُلِ تر کر کے
آئی، تنِ شفّاف کی موزُونی میں
وہ، خاص خطوط کو اُجاگر کر کے

جب پہنچا تو محرابِ یقیں میں دیکھی
ناگن سی کوئی جسمِ حَسیں میں دیکھی
اک بولتی چلتی ہوئی رعنائی کی
تصویر تھی، جو شاہ نشیں میں دیکھی

"خلوت میں کیا کچھ نہ اِشارا اُس نے
تھے بندِ قبا زد پہ نہ دیکھا اُس نے
وہ حسن کو کیا جانے"۔ مرے بارے میں
آئینۂ حمّام میں سوچا اُس نے

آئینے سے بولی کہ پیئے جاتے تھے
اللہ کا بس نام لیئے جاتے تھے
میرے تنِ شفّاف کو دیکھا ہی نہیں
باتیں وہ تصوّف کی کیئے جاتے تھے

جب پیار کے تو دیکھ رہی تھی سپنے
جاگی، تو لگی عشق کی مالا جپنے
ریشم کی وہ تکیے پہ کشیدہ کاری
گالوں پہ نِشان چھوڑ گئی تھی اپنے

اے شوخ! تو حمّام میں جب کُھل جائے
لوہا جو غرور کا ہے تیرے، گل جائے
گر خود کو، اَنفی کرکے نگاہوں کی مری
آئینے میں دیکھے تو پتہ چل جائے

متفرقات

اس سرکشِ وحشی کی کمر توڑ بھی دو
اس باغیِ گستاخ کا سر پھوڑ بھی دو
اتنے میں، حسینوں نے کہا منّت سے
یہ مست قلندر ہیں، انھیں چھوڑ بھی دو"

میں ہوں، وہ بھی شیدائے گلابی کیا ہے!
میری ہی طرح وہ بھی شرابی کیا ہے!
جاناں کا ہے اِک چاہنے والا، ورنہ
کچھ اور رقیب میں خرابی کیا ہے!

جاں مانگی تو وہ سامنے آیا بڑھ کر
وہ سر کو جھکا کے مُسکرایا بڑھ کر
جاناں کے لیئے میں نے تو ناخن نہ دیا
گردن کو رقیب نے کٹایا بڑھ کر

ہے وہ ہی، جو ہو شیر کا بچہ، عاشق
وہ پکا تھا اور میں کہ تھا کچا عاشق
میں تو تھا برائے نام، ورنہ سچ ہے
جاناں کا رقیب ہی تھا سچا عاشق

اونچا کتنا نصیب ہوتا اپنا
محبوب کہ خود حبیب ہوتا اپنا
جاناں کے لیئے جان بھی دیدی ہوتی
میں خود جو اگر رقیب ہوتا اپنا

خطبات مساجد میں، مکاتِب میں سبق
محلوں میں لکھے ہوئے لکھو کا ہی ورق
اُن سب سے ہے اِک کروڑ درجے بڑھ کر
کُٹیا میں قلندر کی یہ "ہُو حق ہُو حق"

منطق کی سمجھتے ہوئے گھاتیں یہ لوگ
بحثوں میں گزارتے ہیں راتیں یہ لوگ
میں تیرے ہی بارے میں فقط سوچتا ہوں
کرتے ہیں اِدھر اُدھر کی باتیں یہ لوگ

آگے سے ترے گزرا وہ محزوں، زاہد!
اِس پر تجھے اتنا طیش ہے کیوں؟ زاہد!
اُس کو نہ تھا علوم تو پڑھتا ہے نماز
لیلیٰ کے خیال میں تھا مجنوں، زاہد!

تبلیغ کی چوٹیوں پہ گویا چڑھ کر
لاحول ولاقوۃ یعنی پڑھ کر
کل شیخ نے مینا پہ جو پتھر مارا
میں نے دلِ بیتاب پہ روکا بڑھ کر

تحفے میں رقیب نے جو خوشبو دی تھی
یہ سوچ کے اُس شوخ نے آخر لی تھی
مِلنا تھا اُسی شام کو مجھ سے آکر
مہکی ہوئی آئی تو کشش کتنی تھی

روشن جو تخیّل میں وہ صورت کی تھی
معراجِ تصوّر کی بدولت کی تھی
کل شب کے اندھیرے میں سمجھ کر پروین
تا دیر، ثریّا سے محبّت کی تھی

ہیں اور اگر خار تو خنجر تو ہے
بہتر جو ہے سب سے اُس سے بہتر تو ہے
کل رات کسی اور کے، جانِ شیریں!
بوسے لئے میں نے یہ سمجھ کر تو ہے

بجلی جو بدن میں اُن کے چمکی شب میں
پھر اُن کی قبائے علم اُتری، شب میں
کیسے کیسے حکیم، مجھ سے مت پوچھ
کچھ دیر کو ہو جاتے ہیں وحشی، شب میں

ساغر ہو اگر خالی تو بھرتے رہنا
تم یوں تو ہر اک شوخ پہ مرتے رہنا
اِس بزم میں زرق برق، یارو! لیکن
حاکم کی بھی داشتہ ہے، ڈرتے رہنا

لو حسن اُدھر جام بکف جاتا ہے
اور نام مرا کر کے حذف جاتا ہے
ہم حسن پرستوں سے بچا کر دامن
سرمایہ پرستوں کی طرف جاتا ہے

یہ رُوٹ ہے تجارت پہ ہے مسئلہ دیکھو
دولت کا جو کھنچ رہا ہے رستہ دیکھو
حاکم کے لیے محفلِ مے ہے، اِس میں
زردار کی داشتہ کا ٹھسّہ دیکھو

وہ محفلِ تاجران برائے حکام
میں اُٹھ گیا، بور ہو کے، وہیں چھوڑ کے جام
اُٹھتے ہی مرے، جتنے حسیں تھے وہ بھی
اِک اِک کر کے وہاں سے اُٹھے کل شام

اُنگُشت، جب اَعداد کے غم سہتی ہو
تم ہو کہ نہیں؟ جب یہ خَلِش رہتی ہو
اِک جان سی پھر جان میں آجاتی ہے
تم فون پہ جب خود ہی "ہلو" کہتی ہو

کل فون پہ، تجھ سے، اے سراپا انداز
وہ گفتگو کرنی تھی، سَراسَر تھی جو راز
اُس بات کی شہ رگ پہ چھُرا اُٹھی گویا
بھاری سی جو اِک آئی "ہلو" کی آواز

ہاں جملہ خُرافات پہ "جی جی" "جی جی"
مُہمَل سی روایات پہ "جی جی" "جی جی"
ہاں کہتا ہوں بنتِ شیخ! تیری خاطر
میں شیخ کی ہر بات پہ "جی جی" "جی جی"

کب سمجھے، مُحبّت کے لیئے آیا تھا
اِک چاند سی صورت کے لیئے آیا تھا
پہنچا تو تھے اُس شوخ کے بابا بیمار
وہ سمجھے عیادت کے لیئے آیا تھا

میں نے دلِ بیتاب پہ کھا کر گھاؤ
اس گاؤں سے جانے کو منگائی جب ناؤ
مہ پاروں نے آرائشِ کاکل چھوڑی
دشمن نے مگر مونچھ پہ اپنی دیا تاؤ

جب شہر میں میخوارِ عراقی نہ رہا
شوقینِ سحر آئینوں کا ساقی نہ رہا
آئینہ فروش کی تجارت کا فروغ
جاتے ہی مرے شہر میں باقی نہ رہا

اک سانولی ہے، خود بھی نہیں ہوں گھر میں
جس گوشے میں وہ ہے، میں وہیں ہوں گھر میں
یہ در پہ جو دے رہا ہے گوری دستک
اس سے کوئی کہہ دو کہ نہیں ہوں گھر میں

جاناں سے کسی طور جو دوری کر لوں
پھر سے دلِ خاکی کو میں نوری کر لوں
یہ وصل کی راتوں کی مسلسل نیندیں
آئے جو شبِ ہجر تو پوری کر لوں

اُس شوخ نے اجب چھیل چھکی تاریکی
ہر بات میں پیدا کی عجب باریکی
خلوت میں، اِک عاشقہ کی، میرے آگے
کل اُس نے بہت خوب اداکاری کی

اپنے یہاں اِک جشن منایا اُس نے
وہ شوخ تھی، مجھ کو بھی بُلایا اُس نے
میرے لیئے اِک شخص نے پوچھا "ہے کون؟"
"اِک مست قلندر ہیں" بتایا اُس نے

کیا چاہتے مجھ کو ہو، مری جان! ہاں ہاں،
اِس پر مرا یہ کہنا کہ "جانان! ہاں ہاں"
اِک لمحۂ نازک تھا تو کی تھی میں نے
اُس شوخ کی ہر بات پہ "ہاں ہاں! ہاں ہاں"

"تم سے ہے مجھے عشق" بتایا اُس نے
"تم کو بھی محبت ہے؟" یہ پوچھا اُس نے
اِثبات میں سر میں نے ہلایا ایسے
جیسے کہ نفی میں ہو، نہ دیکھا اُس نے

بیٹھی ہوئی دیوار ہے، گرتا در ہے
برسات ہے، برسات میں ہم کو ڈر ہے
شہراہِ منوّر پہ ہے قصرِ جاناں
تاریک سے کوچے میں ہمارا گھر ہے

پر راہ طویل ہے، اسی کا غم ہے
اِس فکر میں دل کا بھی عجب عالم ہے
گر کوچۂ داشتہ سے ہو کر جاؤں
تو فاصلۂ کوچۂ جاناں کم ہے

وہ اُس کی عبارت، وہ ادا کا عالم
وہ عارضِ گلرنگ، وہ گیسو برہم
جب غور سے داشتہ کو دیکھا میں نے
جاناں سے جمال میں نہیں تھی کچھ کم

اِس عشق میں مجبور ہوں، پامال ہوں میں
بیکار ہوں، قلّاش ہوں، کنگال ہوں میں
واں خلوتِ داشتہ میں کیا تھا جو نہ تھا
یاں کوچۂ جاناں میں پھٹے حال ہوں میں

نجد کی طرف مجنوں کی واپسی

رنج کرے جیون کا پہ قفس کا مت کر
جس کام کا تجھ کو نہیں چسکا مت کر
لکھتا ہوں رباعی تو یہ دل کہتا ہے
جو کام نہیں ہے تیرے بس کا مت کر

الوان کے دریا کے کنارے، آجا
لے کر تو خطوط کے سہارے، آجا
تُو خلوتِ تصویر میں، بولی تصویر
واپس مرے صادقین پیارے آجا

جو زخم یہاں کھائے دکھاؤں جاکر
خط، رِستے ہوئے خوں سے بناؤں جاکر
اب منزلِ تصویر میں۔ بہتر یہ ہے
روٹھی ہوئی لوحوں کو مناؤں جاکر

الوان و خطوط کے چمن کی جانب
یعنی کہ مُصوّری کے فن کی جانب
اے شعر کے غیر ملک! آیا کل تھا
جاتا ہوں میں آج اپنے وطن کی جانب

الوان کے ایوان میں چلا آیا ہوں
بڑھتے ہوئے طوفان میں چلا آیا ہوں
میں کوچۂ جاناں سے نکل کر واپس
پھر کوچۂ جاناں میں چلا آیا ہوں

ہاں مُوقلم و لوح کا بگڑا تھا مزاج
الوان کی شہزادی کے سر پر نہ تھا تاج
حلقے میں رباعی کے جو دو دن رہ کر
میں خانۂ تصویر میں پہنچا جب آج

اِک لوح یہ بولی مری آئیں آنکھیں
آیا نہ تو، گو میں نے بچھائیں آنکھیں
کیوں کوچۂ خیام میں جا کر تو نے
لیلائے معانی سے لڑائیں آنکھیں

شوخی نہ شرارت کی نظر سے دیکھا
ہرجائی کو حیرت کی نظر سے دیکھا
میں خانۂ تصویر میں پہنچا جب آج
لوحوں نے شکایت کی نظر سے دیکھا

الفاظ کی بستی سے میں ہو کر کنگال
کل شہرِ مداد میں جو پہنچا بے حال
تو میرے لیے لایا ہے کیا؟ میری طرف
ہر لوح بڑھاتی ہی رہی دستِ سوال

کیں لغزشیں شاعری میں، واپس آیا
پھر کوچۂ بُت گری میں، واپس آیا
تصویروں نے سینے سے لگایا مجھ کو
جب شہرِ مصوّری میں واپس آیا

تھا خلوتوں میں دہکی انگیٹھی کا سماں
سب لوگ سمور میں ٹھٹھرتے تھے جہاں
اور چوک پہ صادقین "ہو حق" کرتا
تھا ننگا پسینے میں شرابور وہاں

ناراض تھی لیلائے نگارش مجھ سے
غصے میں تھی دوشیزۂ بندش مجھ سے
تھا کوچۂ خیام میں اُفتاں خیزاں
ہر گام پہ ہو رہی تھی لغزش مجھ سے

لغزش تو ہوئی خیر سنبھل بھی جاؤ
آوارہ ہو اِس نگر سے ٹل بھی جاؤ
اِس میں رہو اک شب بھی تو رسوائی ہے
خیام کے کوچے سے نکل بھی جاؤ

تصویر میں ساحری کی سوجھی کیوں تھی
عُرفی کو مُصوّری کی سوجھی کیوں تھی
کل میں نے بھی کہہ لیئے تھے اک دو مصرعے
کل مجھ کو بھی شاعری کی سوجھی کیوں تھی

سب ہنستے تھے میں بھی گا کے ننگا ناچا
ہر اک سے نظر ملا کے ننگا ناچا
تاریک و طویل و سرد شب تھی، پھر بھی
میں کوئے ادب میں جا کے ننگا ناچا

طاری اِک خود پہ خبط کر کے میں نے
قائم لفظوں سے ربط کر کے میں نے
کچھ یونہی سی اوراق کی خدمت کی ہے
الوان کے حق کو ضبط کر کے میں نے

پاس اپنے اِک اَلھڑ کے علاوہ کیا تھا
واں دل بھی کوئی دھڑ کے علاوہ کیا تھا
میں کوچۂ خیام میں بولا جو کچھ
مجذوب کی اِک بڑ کے علاوہ کیا تھا

اک بار میں ساحری بھی کر کے دیکھوں
کیا فرق ہے شاعری بھی کر کے دیکھوں
تصویروں میں اشعار کہے ہیں میں نے
شعروں میں مصوری بھی کر کے دیکھوں

SADEQUAIN *Foundation*
9415 Maler Road
San Diego, CA 92129, U.S.A.
www.sadequainfoundation.com
sadequainfoundation@gmail.com
(858) 538-1574

صادقین فاؤنڈیشن

نمائش

جو نقش تھے پامال بنائے میں نے
پھر الجھے ہوئے بال بنائے میں نے
تخلیق کے کرب کی جو کھینچی تصویر
تو اپنے خد و خال بنائے میں نے

رباعیات صادقین کی تقریب اجراء کے موقع پر قدردان فن اور صاحبان ذوق کی تسکین قلب و نظر کے لئے رباعیات پر مشتمل صادقین کے بنائے ہوئے خاکوں (Drawings) کی نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا ہے جو آرٹس کونسل کے منظر اکبر ہال میں ہفتہ ۳ جولائی ۲۰۱۰ء سے منگل ۶ جولائی تک شام ۴ سے ۸:۳۰ بجے شب تک جاری رہے گی۔

آپ کے منتظر

محمد احمد شاہ (سیکریٹری آرٹس کونسل کراچی)
سید سلطان احمد نقوی

پروفیسر اعجاز احمد فاروقی (نائب صدر)
پروفیسر سحر انصاری

رابطہ ۰۳۰۹_۲۷۲۳۳۹۷

تقریب رونمائی

اک بار میں ساحری بھی کر کے دیکھوں
کیا فرق ہے شاعری بھی کر کے دیکھوں
تصویروں میں اشعار کہے ہیں میں نے
شعروں میں مصوری بھی کر کے دیکھوں

صادقین کی رباعیات پر مشتمل کلیات کی تقریب رونمائی ۳ جولائی ۲۰۱۰ء بروز ہفتہ بوقت ۷:۰۰ بجے شام بمقام آرٹس کونسل کراچی منعقد ہوگی آپ کو بطور فن شناس و ادب نواز اس تقریب میں شرکت کی خصوصی دعوت ہے اس موقع پر ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم صدیقی، ڈاکٹر سید جعفر احمد اور محترم تاج حیدر، صادقین کے فن رباعی گوئی پر اظہار خیال کریں گے، محترم راحت کاظمی اور محترم انجم ایاز تحت اللفظ رباعیات پیش کریں گے جبکہ محترم انور مقصود نظامت کے فرائض انجام دیں گے۔

آرٹس کونسل کراچی میں

بروز ہفتہ بتاریخ ۳ جولائی ۲۰۱۰ء بوقت ۶ بجے شام

لوحِ جہاں میں ایک بھولا بھٹکا مسافر

سرمد کے گاڑھے اور سرخ خون کی گرمی کے نام

مختلف النوع فنون کے مختلف المزاج دانوں کو ایک رشتۂ زنار میں پرو کر ایک وحدت میں یکسو تبدیل کرنے کا عمل اداشناسانِ علم و فنون و معارف اور حسن و جمال کی خدمت میں ایک تجربے کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے، آپ سے شرکت کی گزارش خاص ہے۔